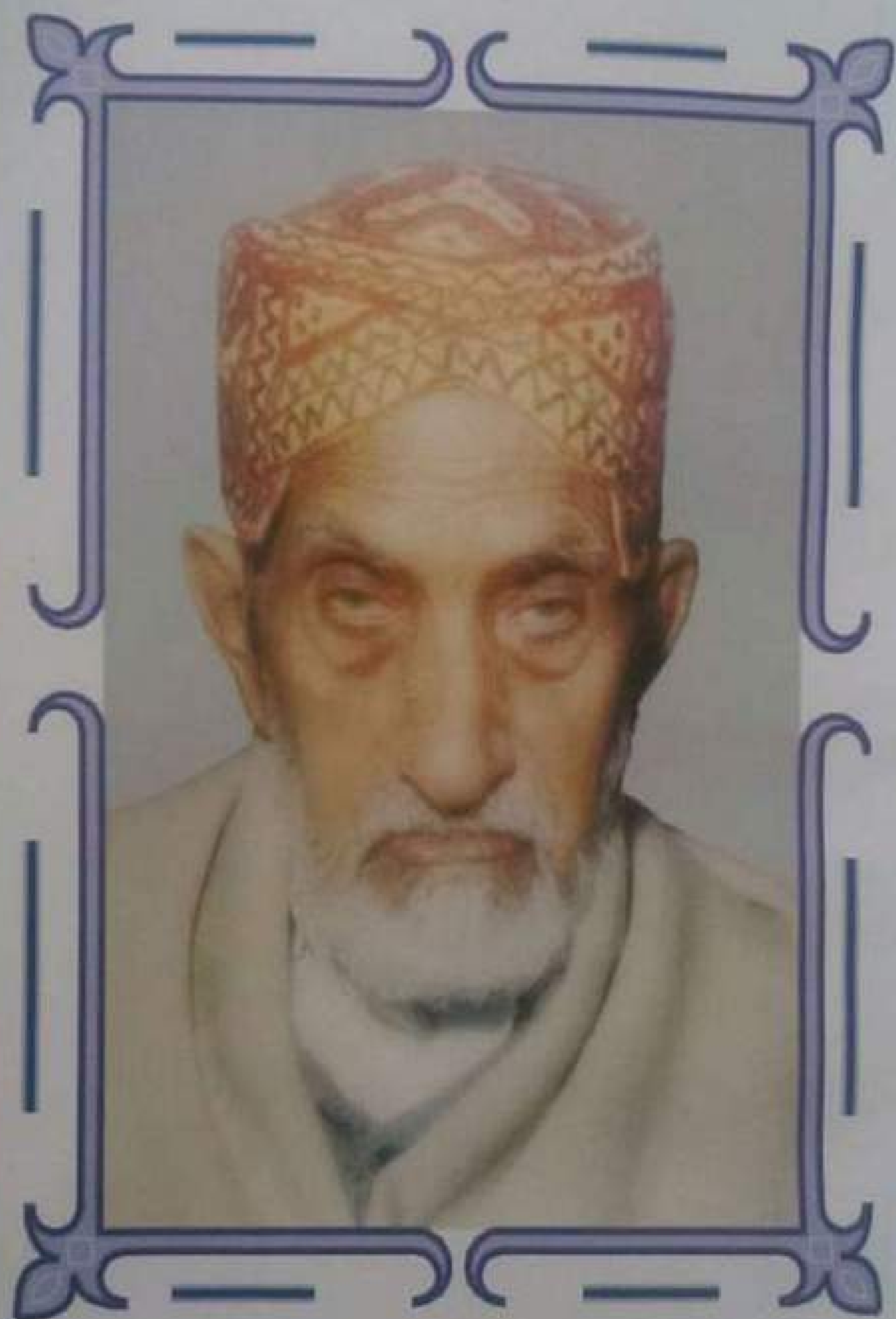
میر صاحب اعلی اللہ مقامہ

(چند رموز)

www.TaabeerMurtaza.ml

میر صاحب اعلی اللہ مقامہ

(چند رُموز)



سیّد شفاء احمد نقوی (میر صاحب)

میرؔ صاحب (اعلیٰ اللہ مقامہٗ)

- ایڈیشن .... اوّل
- سن اشاعت .... نومبر، ۲۰۰۷ء
- ناشر .... حزب الطالبین

پرنٹرز .... صائمہ پرنٹرز اینڈ پبلشرز، کراچی۔
0300-2196927

ملنے کا پتہ

15۔الف، بلاک نمبر:2۔ پی ای سی ایچ ایس، کراچی۔

فون نمبر:۔4551767

بسمہٗ

وجہ تالیف

یہ غالباً سال گذشتہ ۲۰۰۶ء کی آخری سہ ماہی کی بات ہے کہ ہفتہ وار مجلس کے بعد جو اتوار کو رضوی صاحب کے گھر پر ہوتی ہے حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ آئندہ جب ہم میں سے کوئی بقید حیات نہ ہو اگر کوئی میؔر صاحب کی تصانیف سے متاثر ہو کر اُن کے متعلق کچھ اور جاننا چاہے تو اُس وقت اُس کے اِس شوق کی تسکین کی کیا سبیل ہوگی۔ خصوصاً جب وہ روایتی سوانح حیات کے علاوہ، جیسا کہ تاریخ سادات امروہہ میں درج ہے، موصوف کی روحانی زندگی کے اُن باطنی پہلوؤں کے متعلق تجسّس میں ہو جن پر اُن کی نگارشات سے خاطر خواہ روشنی نہیں پڑتی۔

اِس پر سامعین کا خیال اُن لوگوں کی طرف گیا جو بذاتِ خود میؔر صاحب کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہونے کا شرف رکھتے ہیں اور بفضل اللہ تعالیٰ تا حال پاکستان میں موجود ہیں۔ چنانچہ پہلے تو یہ طے ہوا کہ جو یاد آئے اسے نکات کی شکل میں نوٹ کر کے ٹیپ (Tape) کر لیا جائے۔ وہ کر تو لیا گیا مگر بعد میں جب سنا گیا تو بالکل غیر واضح تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اِس صورتِ حال میں ڈاکٹر جاوید صاحب نے مشورہ دیا کہ اس کو کتاب کی شکل میں چھاپ دیا جائے۔ یہ بات متفقہ طور پر سب کو پسند آئی۔

چنانچہ جن حضرات سے رابطہ کیا گیا اُن کے اسماء گرامی میؔر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کے اعتبار سے بالترتیب یہ ہیں:۔

(۱) ظفر الحسن زیدی صاحب۔ (۲) شبیر بلگرامی صاحب۔

(۳) سبط اکبر رضوی صاحب۔ (۴) ذیشان صاحب۔

مندرجہ بالا حضرات سے درخواست کی گئی کہ صرف اور صرف انہیں واقعات کو جو بہ چشم خود دیکھے ہوں اور صرف اور صرف انہیں ارشادات کو جو انھوں نے خود بلا واسطہ میر صاحب سے براہ راست سنے ہوں، کسی اور کی زبانی نہ سنے ہوں، ضابطۂ تحریر میں لائیں تا کہ انھیں آنے والوں کیلئے کتاب کی شکل میں پیش کیا جائے۔ یہ شرائط اس لئے رکھی گئیں کہ مندرجات حقیقت پر مبنی رہیں اور افسانہ نہ بنیں۔

ادارہ ان تمام حضرات کا ان کی نگارشات کیلئے شکر گذار ہے۔

ادارہ حزب الطالبین

کراچی

۲۵ جنوری ۲۰۰۷ء



بسمہٗ

تعارفی اقتباسات

قارئین کی خدمت میں چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں تا کہ میر صاحب کے تعارف میں مدد ملے۔ میر صاحب کے جدِ امجد سید شرف الدین شاہ ولایت واسطی اپنے والد کے ہمراہ زمانہ سلطان فیروز شاہ (۶۸۸ء تا ۶۹۵ء) میں عراق کے شہر واسط سے ہند تشریف لائے۔ اس نسبت سے میر صاحب واسطی کہلائے۔ آپ کا نام سید شفاء احمد نقوی اور ادیم تخلص تھا۔

درج ذیل اقتباس ''مرثیہ نگارانِ امروہہ''۔ طباعت ۱۹۸۴ء۔ مصنف عظیم امروہوی۔ طابع مہران پریس۔ کراچی۔ منجانب الاتحاد کمیٹی رجسٹرڈ۔ کراچی کے صفحہ ۴۴۶ تا ۴۴۸ سے لیا گیا ہے۔

> ''ادیم کی ولادت ۲۶ رجب المرجب ۱۳۱۱ھ بمطابق ۳ فروری ۱۸۹۴ء بروز شنبہ ہوئی۔ زمانۂ طفلی میں ہی سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم زمانے کے رواج کے مطابق گھر پر ہی ہوئی۔ اس کے بعد ہائی اسکول کی سند حاصل کی لیکن ذاتی مطالعے کے سبب اردو کے علاوہ فارسی، عربی اور ہندی زبانوں میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ حافظِ قرآن بھی تھے۔
>
> کسبِ معاش کے لئے اوائل عمر میں ہی گھر چھوڑنا پڑا۔ ابتدا میں روڑکی و دہرہ ڈون میں ملازمت کی۔ بعدہٗ ملٹری انجینئرنگ سروس میں ٹیکنیکل انجینئر کے عہدے پر شہر پشاور میں تقرر رہا۔ وہاں سے میراں شاہ تبادلہ

ہوا۔ کچھ عرصے بعد ملتان چھاؤنی میں سب ڈویژنل آفیسر مقرر ہوئے۔ جہاں سے فیروز پور چھاؤنی تبادلہ ہوا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران فیروز پور سے عراق تبادلہ ہوا۔ واپسی پر تحریکِ آزادی سے متاثر ہو کر انگریزی حکومت سے مستعفی ہوئے۔

ادیم کی دو شادیاں ہوئیں۔ زوجۂ اولیٰ سے صرف دو اولادیں ہوئیں۔ ۸ جون ۱۹۲۸ء کو آپ کا عقدِ ثانی ہوا جن سے چار لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں۔ اَب صرف چار اولادیں بقیدِ حیات ہیں۔ بڑے فرزند میر علی صادق حکومتِ ہند کے محکمۂ تجارت دہلی میں ملازم ہیں۔ آپ قومی خدمات سے بھی خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ منجھلے فرزند سید علی خاصف کراچی (پاکستان) مرچنٹ نیوی میں کپتان ہیں۔ اور چھوٹے سید علی عارف محکمہ کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ لیباریٹری لکھنؤ میں سائنٹسٹ ہیں۔ ادیم نے مئی ۱۹۴۹ء کو اپنے آبائی وطن سے کراچی ہجرت کی۔ ۱۷ فروری ۱۹۷۵ء مطابق ۵ صفر ۱۳۹۵ھ کراچی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم کا جسدِ خاکی تحریری وصیت کے مطابق بذریعہ طیارہ لاہور لے جایا گیا جہاں عزا خانہ بابا صدا حسین شاہ بخاری جلالی قلندری واقع شاہدرہ میں سپردِ خاک کیا گیا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ادیم کے استاد کون تھے تو اس سلسلے میں انہوں نے اپنے ایک مرثیے میں خود واضح کر دیا ہے کہ اُن کا کوئی استاد نہیں تھا۔ اسی لئے انہوں نے اپنی شاعری اور فن کے لئے کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ بس کہ فرماتے ہیں کہ۔

عرض اَب خدمت احباب میں کرتا ہے ادیم — کہ یہ عاصی نہ ہے شاعر نہ ہے عالم نہ فہیم
مجھ کو اس فن میں فقط سمجھئے اک نیم حکیم — میں نہیں جانتا اس فن کی الف بے اور جیم

پہلے لکھنا نہ میسر کبھی اک بند ہوا
حکم مولاؑ کا جو پہنچا، سو قلم بند ہوا

ادیم کی تصانیف جو زیورِطبع سے آراستہ ہو چکی ہیں ان کی تعداد بھی کافی ہے۔ تقسیمِ ہند سے قبل "پیغامِ رسولؑ"۔ "الحسین والبُکا"۔ "قربانیٔ عظمیٰ"۔ "فلسفۂ وضو"۔ "راہِ ارم"۔ "مشعلِ نور" اور "خاتونِ قیامت" وغیرہ شائع ہوئی ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد "اہلِ جہنم"۔ "جاہلیت کی موت"۔ "جہاد فی اللہ"۔ "ہل من ناصر"۔ "خونِ ناحق"۔ "مجالس الصادقین"۔ "اہل البیت"۔ "جامع الانوار"۔ "انوارالایقان"۔ "تعلیم الاسلام برائے اطفال و مبتدیان"۔ "محسنِ عالم" اور "مدحِ اولیاء" وغیرہ نثر اور شعری مجموعے۔ مراثی، نوحہ، سلام، مسدس اور قصائد پر مشتمل ہیں۔ ان کے علاوہ "الرسولؑ" قلمی موجود ہے"۔

کراچی میں ادیم کے ہم خیال ومعتقدین حضرات کا ایک وسیع حلقہ تھا اور آپ نے ایک ادارہ حزب الطالبین قائم کیا تھا"۔ (اقتباس ختم ہوا)۔

نوٹ: درج بالا تصانیف میں پیغامِ رسولؑ اور فلسفۂ وضو اَب موجودہ کتاب "جامع الانوار" میں شامل ہیں۔

خود اپنا تعارف

ذیل میں ہم وہ اقتباسات پیش کر رہے ہیں جو میر صاحب اعلیٰ اللہ مقامہٗ ہی کی تصانیف سے اخذ کیے گئے ہیں۔ انوار الایقان۔ طباعت ۱۹۸۷ء صفحہ ۳۱۳ پر بکر السالکین والعارفین کے

ذیل میں فرماتے ہیں۔

"صاحبانِ معرفت اولیاء اللہ حاملانِ نورِ ایمان حجاب ہی میں رہتے ہیں۔اور بالکل عام لوگوں کی طرح زندگی گذارتے ہیں۔کسی کو شبہ بھی نہیں ہوسکتا کہ ان کو قربِ خداوندی حاصل ہے۔اس طرح پسِ پردہ خدمتِ خلق میں منہمک اور طالبین کو فیض پہنچانے میں مصروف رہتے ہیں۔سوائے چند رازداروں کے کوئی ان کے حال سے واقف نہیں ہوتا۔ اگر کسی وقت ان کا راز افشا ہو جائے تو ان کو گوشہ نشینی اختیار کرنی پڑتی ہے"۔

صفحہ ۳۰۶ پر تحریر فرماتے ہیں۔

"حقائق کا بیان لوگوں کے لئے ایسا ہی ہوتا ہے جیسے جنات یا پرستان کے قصے سن لئے۔اس لئے کہ نفسِ انسان کو جس کیفیت کا احساس یا ادراک نہ ہوا ہو، جو اس کے تجربہ میں نہ آئی ہو اس کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اُن کا بیان کرنا چنداں مفید نہیں ہوتا۔البتہ طالبین کے لئے ضرور مفید ہوتا ہے صرف اس غرض سے کہ طالبین محروم نہ رہیں جو کچھ علم سینہ بہ سینہ اس حقیر کو اہلِ بصیرت سے پہنچا ہے تحریر کرتا ہوں"۔

اختصار کے لئے یہاں چند سطروں کو حذف کیا گیا ہے۔اور جس نکتے کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے وہ صفحہ نمبر ۳۰۸ پر یوں درج ہے۔

"عوام حقائق کا بار نہیں اٹھا سکتے۔ جناب ربّ العزّت تو فرماتا ہے۔ "لایکلف اللہ نفساً الا وسعھا "(البقرۃ۔۲۸۶)۔(اللہ کسی نفس کو اتنی تکلیف نہیں دیتا جس کی اس میں وسعت نہ ہو)۔یعنی کسی نفس پر اس کی

وسعت واہلیت سے زیادہ بار نہیں ڈالتا۔ لہٰذا بندگانِ خدا پر بھی لازم ہے کہ کسی شخص کے سامنے ایسی حقیقت بیان نہ کریں جس کا بار اٹھانے کی اس میں اہلیت نہ ہو۔ اب سالکین راہِ مولا کی مشکلات پر غور کریں اگر ان کی زبان پر کوئی ایسی بات آجائے جو حق کے رازوں سے ان پر منکشف ہوئی ہے تو سننے والا اس کا بار نہیں اٹھا سکتا۔ کیونکہ ہر سامع پر اس کی اہلیتِ نفس کے مطابق اثر ہوتا ہے۔ ایک صاف دل صاحبِ خلوص تو ممکن ہے ہوش کھو بیٹھے، اس پر تو حق ایک دم آشکار ہو جائے گا۔

چنانچہ ایک اپنا مشاہدہ پیش کرتا ہوں:۔

ایک کاریگر جوڑی کا متوطن تھا پشاور میں ملازم تھا۔ اس نے امام غزالی کی احیاء العلوم کے ترجمہ کا مطالعہ کیا تو ریاضت کرنے لگا۔ ملازمت ترک کر دی اہل وعیال سے غافل ہو گیا۔ اکثر طالبانِ حق کے پاس جاتا اور مسائلِ معرفت پر گفتگو کرتا۔ اُس غریب کو تو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ اس راہ میں خاموشی لازم ہے۔ ایک روز ایک واقفِ اسرار کے پاس گیا۔ اتفاق سے یہ بندۂ حقیر بھی وہاں حاضر تھا۔ وہ شخص صاحبِ موصوف سے گفتگو کر رہا تھا چونکہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ اب کافی واقفیت حاصل کر چکا ہوں ایک بات پر بحث کرنے لگا اور اپنی بات پر اڑ گیا۔ وہ ٹالتے رہے مگر یہ مصر رہا۔ صاحب موصوف کے سامنے کلام اللہ کھلا ہوا رکھا تھا۔ انہوں نے ایک آیت کی طرف اس مستری کی توجہ دلائی کہ لو اس کو پڑھ لو۔ مستری نے ایک چیخ ماری اور ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ اُٹھ کر بھاگا، سر دروازے سے ٹکرایا۔ سخت چوٹ آئی خون جاری ہو گیا اور بیہوش ہو کر

دروازے کے سامنے ہی گر گیا۔ اس کے اعزہ بھی سامنے والے مکان کی بیٹھک میں موجود تھے۔ سب دوڑے آئے۔ بندہ بھی باہر آ گیا۔ سب نے مل کر اٹھایا اور اس کے گھر پہنچایا۔

واقفانِ اسرار کا تو ذکر ہی کیا ہے، ایک مولوی صاحب اس بندۂ حقیر سے ایک امر پر تکرار کر رہے تھے۔ بالآخر ایک فقرہ میری زبان سے نکل گیا۔ قریب تھا کہ ان کو غش آ جائے۔ خیریت یہ ہوئی کہ آرام کرسی پر بیٹھے تھے کہ پیچھے کو گر گئے۔ اگر کہیں آرام کرسی نہ ہوتی تو معلوم نہیں کیا حشر ہوتا۔ اس پر میں نے اپنے اوپر نفرین کی اور مالک کی بارگاہ میں توبہ اور استغفار کرتا رہا۔ اسی لئے عوام الناس پر حقائق کا اظہار کرنا منع ہے"۔

جامع الانوار میں رسالہ پیغامِ رسولؐ کے باب اوّل میں ایک واقعہ کا یوں ذکر کرتے ہیں۔

"لکھنؤ میں یوسف حسین خان صاحب ایک مشہور بیرسٹر تھے۔ صاحبِ جائیداد کثیر۔ گویا ایک چھوٹے سے تعلقہ دار تھے۔ ان کا ایک موضع "بسہا" لکھنؤ سے چھ میل جانب شمال واقع تھا جہاں کنکر بہ کثرت نکلتا تھا۔ اس کے لئے بیرسٹر صاحب نے اس موضع میں کنکر کے چونے کا ایک کارخانہ قائم کیا ہوا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں اس کارخانہ کا چارج میرے ہاتھ میں آیا۔

موضع کے مکھیا ایک دوبے جی (برہمن پنڈت) تھے جو علمِ نجوم میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کا ایک بیٹا جس کی عمر تقریباً تیس سال کی ہوگی اکثر کارخانے آتا۔ اس کے ساتھ اکثر بات چیت ہوا کرتی۔

اس طرف بارش اکثر ۱۵ جون کے قریب قریب شروع ہو جاتی تھی مگر

اس سال بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ جون کی آخری تاریخیں تھیں مگر بارش کا نام ونشان نہ تھا۔ گرمی بڑی شدت کی پڑ رہی تھی۔ لوگ گرمی سے تڑپ رہے تھے بارش کی دعائیں کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں ایک روز کھیاجی کے صاحبزادے تشریف لائے۔ دفتر میں بیٹھے باتوں میں مصروف تھے کہ بارش کا ذکر آ گیا۔ پنڈت جی کہنے لگے:

''ابھی بارش نہیں ہو سکتی۔ جوتش میں مہورت ہی نہیں۔ ابھی تو پندرہ دن بارش نہ ہوگی''

میری زبان سے نکل گیا کہ:

''رب چاہے تو ہو سکتی ہے''۔

پنڈت بے ساختہ بولا:

''اجی رب بھی چاہے تو کیا ہو سکتا ہے۔ جب مہورت ہی نہیں تو بارش ہو ہی نہیں سکتی''۔

پنڈت جی کا یہ فقرہ ایک نشتر تھا جو دل میں اتر گیا۔ دل کی حرکت بہت تیز ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مالک کی طرف لو لگ گئی۔ دل کہتا تھا کاش کہ یہ گستاخانہ فقرہ سننے سے پہلے ہی مر گیا ہوتا۔ فوراً ایسا ہوا جیسے کوئی دل میں ڈالتا ہے کہ کہدے ''بارش ہوگی''۔ میں نے فوراً بغیر ارادے کے ہی کہا ''بارش ضرور ہوگی''۔ پنڈت جی مسکرائے اور بولے ''اجی بارش نہیں ہو سکتی''۔ میں نے کہا '' آج ہی ہوگی''۔ پنڈت نے کہا ''ممکن ہی نہیں''۔ میں نے کہا ''ابھی ہوگی''۔ اور یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر زبان سے نکل رہا تھا۔

دل میں ایک امنگ سی اُٹھ رہی تھی کہ آسمان کو دیکھ۔ میں آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ پنڈت ہنستا رہا۔ اتنے میں ایک ابر نمودار ہوا۔ میں نے کہا دیکھو ابر نمودار ہو رہا ہے۔ اس پر پنڈت زور سے ہنسا اور بولا ''اجی یہ کیا ہے؟'' اتنے میں وہ تبدریج بڑھتا رہا یہاں تک کہ ایک گھنٹہ کے اندر افق پر چھا گیا اور بارش ہونے لگی پھر خوب زور کی بارش ہوئی۔ میں سجدۂ شکر بجالایا۔ اور جتنے مسلمان وہاں موجود تھے بہت خوش ہوئے اور سب نے پنڈت جی کو خوب شرمندہ کیا۔ فالحمدللہ رب العلمین''۔

آپ نے اپنی تصانیف میں بحکم مولاٰ مذہب حقہ کے ان راز ہائے سربستہ سے پردہ اُٹھا کر حقائق کا اظہار کر دیا ہے جو صدیوں سے اولیاء اللہ کے سینوں میں محفوظ رہے ہیں۔ جیسا کہ ''انوار الایقان'' میں ''حرفِ اوّل'' کے ذیل میں فرماتے ہیں۔

''ناظرین کی خدمت میں التماس ہے کہ یہ کتاب دہریت کے خلاف لکھی گئی ہے اور دہریت کے پروپیگنڈے کے ابطال کے لئے حقائق کا اظہار ضروری ہے۔ جس کے بغیر اس کا مقابلہ کرنا دشوار ہے۔ اور اظہارِ حقائق ناتربیت یافتہ اذہان کے لئے مضر ہے۔ مگر تعلیم یافتہ طبقہ کو دہریت سے بچانے کے لئے اس کے سوائے کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ ان رازوں کو ظاہر کر دیا جائے جو تیرہ سو سال سے اولیاء اللہ صاحبانِ معرفت کے سینوں میں محفوظ رہے ہیں اور سینہ بہ سینہ ہی چلے آئے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ قرآن و حدیث کے وہ حقائق جو سائنس جدید کی تحقیقات سے منظرِ عام پر آگئے ہیں جس سے تعلیم یافتہ طبقہ میں ان کے سمجھنے کی اہلیت پیدا ہو گئی ہے ظاہر کر دیے جائیں''۔

مقصدِ شہادت و مقصدِ ذبحِ عظیم جو ابھی تک عیاں نہیں کئے گئے تھے ان کو اپنی تحریروں میں مفصل اور واضح طور پر بیان کر دیا ہے۔ اس بارے میں ''محسنِ عالم'' میں '' آغازِ سخن'' کے ذیل میں یوں رقمطراز ہیں۔

''بعد حمد و نعت حقیر مصنف خدمتِ ناظرین میں عرض پرداز ہے کہ ہماری مجالسِ عزاء کو جاری رہتے ہوئے صدیاں گذر چکی ہیں مگر کسی تقریر یا تحریر میں مقصدِ شہادت واضح نہیں کیا جاتا۔ چند افراد نے اشارۃً و کنایۃً اگر اظہار کیا بھی ہے تو اس طرح کہ سوائے واقفِ اسرارِ اہلِ بیت اور کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ پچھلی صدی تک تو مقصدِ شہادت کے واضح نہ ہونے سے کچھ نقصان نہیں تھا مگر اس صدی میں دہریت کا بڑا منظم پروپیگنڈہ ہو رہا ہے جس کے باعث ہر نوجوان چون و چرا کے بغیر کچھ سننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ لہٰذا اَب اِس کی اشد ضرورت ہے کہ مقصدِ شہادت واضح طور پر بیان کر دیا جائے''۔

اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۸ پر مقصدِ ذبحِ عظیم کی تفصیل کے بارے میں فرماتے ہیں۔

''ذبحِ عظیم کے تمام مقاصد کو لکھنا چاہیں تو اگر تمام سمندر سیاہی بنیں، تمام اشجار قلم ہوں، تمام جن و انس لکھنے والے ہوں اور سیاہی بھی ختم ہو جائے مگر مطلب پورا نہ ہو سکے اور جو کچھ بھی لکھا جائے وہ سب رموز و نکاتِ دقیقہ ہوں اور عوام اس سے مستفیض نہ ہو سکیں۔ لہٰذا ایک مقصد کا صرف ایک ایک جزو ہی بحث کے لئے اختیار کرنا بہتر ہے جو بسبب شہرت متواترہ قریب الفہم ہے اور ہر شخص اس کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اس لیئے کہ منبروں پر صدیوں سے اسی موضوع پر تقریروں کے دریا بہہ

رہے ہیں۔ اخباروں اور رسالوں میں مضامین کے انبار لگا دیے گئے ہیں لہٰذا اِس کو سمجھنے میں کسی شخص کو کوئی دقت پیش نہ آئے گی مگر مشکل یہ ہے کہ اس ایک جُز کو بھی تفصیل سے لکھنے کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا اجمال لازم ہے"۔

اسی تصنیف "محسنِ عالَم" کی نظم نمبر ۳ میں پوشیدہ رازوں پر سے پردہ اُٹھاتے ہوئے بند نمبر ۵۵ میں اپنی کیفیت کا اظہار اِس طرح فرماتے ہیں۔

طلب تو ہے کہ ابھی اور درد سہہ لیتا — بحارِ نور میں تھوڑا سا اور بہہ لیتا

خدا کے سائے میں کچھ دیر اور رہ لیتا — ولی کی شان میں تھوڑا سا اور کہہ لیتا

مگر وہ ختم نہ ہوگی، کہے ہی جاؤں گا

تو جو سُنانا ہے پھر کس طرح سُناؤں گا

جیسا کہ اُوپر بیان ہو چکا ہے کہ میر صاحب اعلیٰ اللہ مقامہٗ نے ایک ادارہ حزب الطالبین قائم کیا تھا۔ یہ اِدارہ بحمداللہ کراچی۔ پاکستان میں رجسٹرڈ ہے اور آپ کی تصانیف کے جملہ حقوق اسی ادارے کے پاس محفوظ ہیں۔

ڈاکٹر جاوید عباس



واقعات
و
ارشادات

www.TaabeerMurtaza.ml

بسمہٗ

سیّد ظفر الحسن زیدی صاحب

۱۹۶۳ء کی آخری سہ ماہی میں لندن میں میری ملاقات کراچی کے ایک عابد شب زندہ دار بزرگ مرغوب احمد صاحب سے ہوئی جن کا اُن کی عبادات کے حوالہ سے مجھے غائبانہ تعارف پہلے سے تھا۔

انھوں نے ایک بزرگ کا ذکر یہ کہہ کر کیا کہ ''میرے نزدیک اگر امامِ زمانہ کا کوئی نمائندہ کراچی میں ہوسکتا ہے تو اس لائق صد احترام شخصیت کا اسمِ گرامی ''سیّد شفاء احمد نقوی'' ہے۔ وہ (P.E.C.H.S.) میں قیام پزیر ہیں اور یہ انکا پتہ ہے۔ میں جنوری ۱۹۶۴ء میں پاکستان واپس آیا۔ خوش قسمتی سے میرا دفتر بھی (P.E.C.H.S.) میں ہی تھا۔ میں نے پہلے دن ہی دفتر سے فارغ ہوکر ان بزرگوار کی قیام گاہ کی تلاش کی۔ اطلاع کرائی کہ اگر مجھے شرف باریابی حاصل ہوسکے تو یہ میرے لئے سعادت کا باعث ہوگا۔ مجھے بزرگوار نے اندر بلوالیا۔ میں نے سیّد مرغوب احمد شاہ صاحب کے حوالہ سے اپنا تعارف کرایا۔ ابھی میں اپنی کیفیت بیان کر ہی رہا تھا کہ حضرت نے میری سابقہ تاریخ ہی مجھ سے بیان کردی۔ جس سے مجھے یقین ہوگیا کہ جو کچھ مرغوب شاہ صاحب نے بتایا تھا وہ بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔ میر صاحب اعلی اللہ مقامہٗ نے فرمایا کہ یہ ''منزل حیرت'' ہے۔ بڑی شدید منزل ہے بلکہ آگ کا سمندر ہے۔ اس میں کودنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن گھبرانا نہیں چاہیے مولاؑ ہر دم ساتھ رہتے ہیں اور ضرورت کے وقت مشکل کشائی فرماتے ہیں۔ انھوں نے بڑی محبت سے بیان کیا کہ یوں سمجھو کہ مولاؑ ایک شکاری ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ کوئی شکاری شکار پھنس جانے کے بعد اپنا شکار نہیں چھوڑا کرتا۔ ضرورت کے وقت وہ ڈھیل تو دیتا ہے لیکن چھوڑتا بالکل نہیں پھر کھینچ بھی لیتا ہے۔ پہلی مرتبہ زیارت سے فارغ ہوکر میں خوش خوش گھر چلا گیا۔ اسی روز رات کو خواب میں پھر میر صاحب کی زیارت ہوئی۔ تو انھوں

نے مجھے ایک دعا کے ایک جملے کی تعلیم دی۔ میں صبح جب اُٹھا تو مجھے دعا ئیہ جملہ پوری طرح یاد نہ رہا۔ اگلے دن دفتر سے فراغت کے بعد میں پھر سرکار کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور میں نے خواب کی کیفیت بیان کی اور بتایا کہ جملہ مجھے صحیح طور پر یاد نہیں رہا آپ تصحیح فرمادیں۔ یہ سن کروہ اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے اور مجھے صحیح جملہ بتا دیا جو اُس وقت سے تا حال میرے وظیفہ میں شامل ہے۔

اکثر میں جمعہ کے دن چونکہ دفتر سے جلدی فارغ ہو جا تا تھا تو پہلے سرکار کی بارگاہ میں حاضری دیتا اس کے بعد گھر جاتا۔ ایک روز روانگی کے وقت فرمائش ہوئی کہ آیندہ جمعہ کو جب آؤ گے تو میرے لئے ایک بوتل عرقِ گلاب اور زعفران لے کر آنا۔ میں نے تعمیل کر دی۔ یہ دونوں چیزیں انھوں نے اندر لے جا کر رکھ دیں۔ میں حسبِ معمول کچھ دیر بیٹھ کر گھر چلا گیا۔ دو تین ہفتہ بعد جب میں حاضر ہوا تو میؔر صاحب اعلیٰ اللہ مقامہٗ وہ بوتل اور ایک زعفران سے لکھی ہوئی پلیٹ لے کر آئے۔ اس پلیٹ کو میرے سامنے عرقِ گلاب سے دھو کر اس کا عرق بوتل میں واپس ڈال کر بوتل مجھے دیدی کہ یہ روزانہ تھوڑا تھوڑا کر کے پی لیا کرنا۔ کیسا کریم تھا یہ بزرگ اور کس قدر شفقت مجھ حقیر و ذلیل پر فرمائی کہ اس عرق کے پینے سے میری دنیا ہی بدل گئی۔

حسبِ ہدایت میں نے تقریباً ایک ماہ میں بوتل ختم کی۔ اُس کے بعد دل میں لالچ آئی اور میں نے ایک اور بوتل کیلئے بزرگوار سے التجا کی۔ موصوف نے انکار نہیں کیا بلکہ یہ کہہ کر اجازت مرحمت فرمائی کہ اچھا ایک بوتل اور لے آنا۔ میں نے خوشی خوشی ایک بوتل اور پہنچائی۔ بوتل رکھ کر حضرت اندر چلے گئے۔ پھر مجھے بھی اندر ہی بلا لیا۔ ایک چارپائی پر سرکار بیٹھ گئے۔ پلیٹ اُن کے ہاتھ میں تھی۔ اس پر میرے سامنے ہی لکھنا شروع کیا۔ ابھی ایک قرآنی سورۃ مکمل کی تھی۔ دوسری لکھنے لگے تو لکھتے لکھتے قلم روک دیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ حضرت میؔر صاحب اعلیٰ اللہ مقامہٗ پلیٹ پر کیا لکھ رہے ہیں۔ مجھ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے بھئی یہ کوئی خاص تعویزی کلام نہیں

ہے جو میں لکھ رہا ہوں۔ یہ ہر شخص تقریباً روزانہ ہی پڑھتا ہے۔ لیکن جس کیفیت سے میں لکھ رہا ہوں وہ تم کہاں سے لاؤ گے۔ یہ سن کر مجھ پر تو گویا گھڑوں پانی پڑ گیا۔ میں بے حد نادم ہوا اور ساتھ ہی مجھے یہ یقین بھی حاصل ہوا کہ یہ بزرگ میرے مافی الضمیر سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ میری چوری کا پکڑا جانا ہی اس کا ثبوت ہے۔ دوسری بوتل بھی میں نے پی تو پورے اعتقاد کے ساتھ لیکن اس کا کوئی ایسا اثر میں نے محسوس نہیں کیا جو ذکر کے قابل ہو۔

میں بہر حال حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ آنحضرت نے ایک روز بتایا کہ وہ اپنے وطن امروہہ (ہندوستان) جانے والے ہیں۔ ابھی گھر پہنچے ہوئے چند دن ہی گذرے ہوں گے کہ پاک و ہند میں سرحدی قومی تنازعات ہونے لگے جو بعد میں باقاعدہ جنگ میں تبدیل ہو گئے۔ حالت جنگ میں جو لوگ اِدھر سے اُدھر یا اُدھر سے اِدھر آئے ہوئے تھے وہ رک گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ دو ہفتہ کے بعد جنگ بندی عمل میں آ گئی۔ اور پھر رفتہ رفتہ لوگ اپنے اپنے مقامات پر واپس ہونے لگے۔ جب بزرگوار واپس تشریف لا چکے تو میں حسب معمول حاضر خدمت ہوا۔ میں نے شکایتاً عرض کی کہ حضرت آپ کی غیر موجودگی میں ہمیں بہت پریشانی رہی۔ پوچھا کیوں؟ میں نے عرض کی کہ ۱۵ دن کی جنگ نے ہمیں بے حد خوفزدہ کیا۔ آپ ہمیں چھوڑ کر اگر نہ جاتے تو شاید ہمیں ایسی فکر لاحق نہ ہوتی جو اس جنگ کی وجہ سے ہوئی۔ سن کر تعجب سے کہنے لگے۔ جنگ۔ جنگ کہاں ہوئی۔ حقیر نے عرض کیا سرکار جنگ سے ہندوستان اور پاکستان کے عوام متاثر ہوئے اور اخبارات میں روزمرہ کی جنگ کے حالات چھپتے رہے۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر وقفہ وقفہ سے خبریں نشر ہوتی رہیں۔ اور آپ کا فرمان ہے کہ جنگ کہاں ہوئی۔ امروہہ بہت بڑی آبادی کا شہر ہے

نہیں دے گا۔ اور ساتھ ہی پیشنگوئی بھی کر دی کہ ''ملک ہندوستان شود مانند دشت'' ایک اور بڑے یورپی ملک کے متعلق بھی خصوصیت سے فرمایا کہ اس کا تو نام بھی دنیا کے نقشے میں نہیں رہے گا۔ سرکار یہ کہہ کر خاموش ہوگئے۔ ایک دن میں حاضر خدمت تھا تو میں نے دو بڑی فائلیں دیکھیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کچھ لکھ رہے ہیں کیا؟۔ آپ نے جواباً فرمایا کہ مجھے اَب حکم ہوا ہے کہ عذاب الٰہی کا دور شروع ہوگیا ہے اسکے ساتھ اتمامِ حجت بھی لازمی ہے۔ مولاؑ کا فرمان ہے کہ سب راز کھول کر بیان کر دیے جائیں۔ میں اپنی طرف سے تو کچھ نہیں لکھا کرتا۔ میں نے جو کچھ اس سے پیشتر لکھا وہ بھی مولاؑ ہی کی مہر و کرم سے ممکن ہوا اور وہ سب ۱۹۴۲ء سے پہلے کا ہے۔ اس کے بعد سے اب ۱۹۶۵ء تک بالکل بندش رہی اب جو کچھ میرے سامنے آتا جاتا ہے وہ میں کاغذ پر منتقل کرتا جاتا ہوں۔

یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ حضرت کے دیرینہ مصاحب سید خورشید حسین صاحب (مرحوم) جو کہ پاکستان ریلوے میں ملازم تھے اور کراچی ڈویژن کے ڈویژنل اکاؤنٹس آفسر تھے انہوں نے درخواست کی کہ میرے گھر ایک مجلس ہر ہفتہ ہوجایا کرے تو طالبین کیلئے بے حد مفید ہوگی۔ سرکار نے اتفاق فرماتے ہوئے اجازت دے دی کہ ہر جمعہ کو شام کے ۴۔۵ بجے مجلس کر لیا کریں۔ مجلس ہونے لگی تو کراچی کے ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ ریلوے جناب کاظمی صاحب کو بھی خبر پہنچ گئی۔ انھوں نے جناب خورشید حسین (مرحوم) کو بُلا کر پوچھا کہ کیا آپ کے گھر کوئی پیر صاحب آنے لگے ہیں۔ خورشید صاحب نے بتایا کہ پیر صاحب تو نہیں ایک بزرگ ضرور آتے ہیں۔ کاظمی صاحب نے کہا خورشید صاحب اس سے غرض نہیں کہ وہ پیر ہیں یا بزرگ۔ میں ان سے دو، تین سوال کر کے انھیں خاموش کر دوں گا۔ اب جب وہ آئیں تو مجھے ضرور بلایئے گا۔ میں آپ کے پڑوس ہی میں تو رہتا ہوں۔ جمعہ کا دن آیا۔ خورشید صاحب نے کاظمی صاحب کو بھی اطلاع دے کر مدعو کیا۔ مجلس میں پہلے تو جو کچھ میر صاحب نے مولاؑ کے حکم کی اطاعت میں

لکھنا شروع کیا تھا وہ پڑھا گیا۔ بعد میں میر صاحب نے تقریر شروع کی۔ مجلس ختم ہوگئی۔ اگلے روز خورشید صاحب نے کاظمی صاحب سے بطور خاص معلوم کیا کہ آپ نے تو دو، تین سوال کرنے تھے وہ کئے ہی نہیں۔ جواباً کاظمی صاحب نے بتایا کہ بھائی جو سوال میں نے کرنے تھے ان کا تو جواب ہی بزرگوار نے اپنی تقریر میں دے دیا تھا پھر میں کیا سوال کرتا۔ اگلی مرتبہ جب وہ مجلس میں آئے تو انھوں نے حاضرین سے کہا کہ ہم سب ان کے سامنے ننگے ہیں۔ ''ان سے ڈرنا چاہیے'' اور اس کے بعد پھر جب تک خورشید صاحب ریلوے کے مکان میں مقیم رہے کاظمی صاحب ہر جمعہ کے دن مجلس میں ضرور شامل ہوتے تھے۔ ایسے ہی ایک اور نیک شخصیت جناب محمد شفیع صاحب کی تھی وہ بھی ریلوے کے آفیسر تھے۔ ڈویژن کے میکنیکل انجینئر تھے۔ وہ بھی ایک مرتبہ چھ، سات سوال لکھ کر لائے تھے لیکن اس سے بیشتر کہ وہ سوال کرتے انھیں بھی اسی طرح تقریر میں حضرت نے جواب دے کر مطمئن کر دیا۔ پھر وہ بھی ہمیشہ مجلس میں حاضر ہوتے رہے۔ ان حضرات کی شرکت اس وقت تک ہوتی رہی جب تک کہ خورشید صاحب (مرحوم و مغفور) اپنے ذاتی تعمیر شدہ مکان جو کہ کراچی کے فیڈرل۔ بی۔ ایریا بلاک نمبر ۱ میں واقع ہے، میں منتقل ہوگئے۔ بعد ازاں یہ سلسلہ عارضی طور پر معطل ہوگیا کیونکہ ابھی خورشید حسین صاحب (مرحوم) اپنے نئے مکان میں ضروریات کی تنصیب میں مصروف تھے۔ علاوہ ازیں ان کی اہلیہ جو بہت زیادہ محبِّ اہلِ بیتؑ تھیں علیل ہوگئیں اور کچھ عرصہ بعد اُن کا انتقال بھی ہوگیا۔

ایک روز ایسا ہوا کہ حضرت میر صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ، خورشید صاحب (مرحوم) کے دولت کدہ پر تشریف لائے آپ چند دن قیام کے ارادے سے آئے تھے۔ دورانِ قیام ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا۔ ایسی حالت میں خورشید حسین صاحب (مرحوم) کے لئے میر صاحب قبلہ کی تیمارداری ممکن نہیں تھی کیونکہ آپ اس علاقے میں نو وارد تھے۔ علاج معالجہ کی سہولت قریب میں

کوئی تھی ہی نہیں۔ دوسری طرف اس شمع کے ایک پروانے جناب میجر اصغر علی صاحب (مرحوم) جو کہ خورشید حسین صاحب (مرحوم) کے عزیز بھی تھے۔ میر صاحب کی زیارت اور مزاج پرسی کی غرض سے آئے۔ انھوں نے حالت دیکھ کر خورشید صاحب (مرحوم) سے فرمائش کی کہ اگر آپ کی دل آزاری نہ ہو تو حضرت کو میں اپنی قیام گاہ لے جاتا ہوں جو کہ شہر میں آباد علاقہ میں ہے اور پُر سکون جگہ ہے۔ ہاکی گراؤنڈ متصل جناح اسپتال میں موصوف کا دولت خانہ تھا۔ خورشید صاحب (مرحوم) نے میر صاحب قبلہ سے دریافت کیا تو انھوں نے بخوشی منظور کرلیا اور اسی دن میر صاحب میجر اصغر علی صاحب (مرحوم) کے ہمراہ اُن کے بنگلے پر منتقل ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر مجالس کا سلسلہ پھر جاری ہوا جو کہ مرحوم سید شفاء احمد نقوی صاحب کی حیات تک قائم رہا۔ ان کے بعد بھی یہ سلسلہ تادمِ تحریر ہذا جاری وساری ہے اور انشاءاللہ جاری رہے گا۔

سید خورشید حسین صاحب (مرحوم) کا ذکر کرتے کرتے درمیان میں محررہ بالا مضمون شامل ہوگیا۔ خورشید صاحب سے حضرت کی ملاقات تو بہت پہلے سے تھی۔ ایک دن خورشید صاحب ایک بہت ہی خوبصورت طغریٰ جس پر پنجتن پاک علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اسمائے اعظم بہت ہی خوبصورتی اور خوشخطی سے لکھے ہوئے تھے، خرید کر لائے اور اپنے ڈرائنگ روم میں خیر و برکت کی غرض سے آویزاں کرادیا۔ مجلس کا دن آیا، میر صاحب تشریف لائے۔ خورشید صاحب نے استقبال کیا اور انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ خورشید صاحب نے گفتگو کے دوران اشارہ کر کے میر صاحب سے کہا کہ میں نے یہ طغریٰ پسند کیا ہے۔ بہت خوبصورت ہے۔ میر صاحب فوراً تعظیماً کھڑے ہوگئے اور خورشید صاحب کو حکم دیا کہ اس پر فوراً ایک کپڑا ڈال کر چھپادیا جائے۔ ڈرائنگ روم میں ہر کس وناکس آکر بیٹھیں گے۔ کچھ نجس نگاہیں ان مقدس اسماء پر پڑیں گی تو اس سے فائدے کی بجائے نقصان پہنچ جائے گا۔ یہ اسماء صرف پاک نگاہوں کے حامل ہی کی زیارت کیلئے ہیں۔ ہر شخص کیلئے نہیں۔ صاحبانِ معرفت ان مقدس ہستیوں کا احترام

ایسے ہی ملحوظ رکھتے ہیں۔

ایک اور واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ خورشید صاحب کے یہاں دستور تھا کہ بعد مغرب مجلس ہوتی تھی اور اس کے خاتمہ پر حاضرین کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ شاید کچھ دیر ہوگئی ہوگی خورشید صاحب نے بیگم صاحبہ سے کہا کہ کھانا جلدی تیار کرلیں تاکہ آپ مجلس میں شرکت سے محروم نہ رہ جائیں۔ انھوں نے جواباً طنزیہ انداز میں کہا کہ مجلس میرے مقدر میں کہاں ہے۔ میں تو بس کھانے پکانے ہی کیلئے ہوں۔ شام کو وقت مقررہ پر میر صاحب آئے اور داخل ہونے سے پہلے دروازے پر ہی رک گئے۔ خورشید صاحب جیسے ہی استقبال کیلئے آئے تو ان سے تاکید اً فرمایا گیا کہ آج کے بعد مجلس میں آپ کسی کو بھی کھانا نہیں کھلائیں گے۔ بس چائے کے ساتھ بسکٹ سے تواضع کی جایا کرے۔ اس وقت سے اس مخصوص مجلس میں آج بھی چائے اور بسکٹ ہی تبرک ملتا ہے۔

ابھی خورشید حسین صاحب (مرحوم) اپنے سرکاری مکان ریلوے بنگلوز میں تھے۔ مارچ کا مہینہ تھا۔ مارچ میں سب جانتے ہیں کہ نوروز بھی ہوتا ہے۔ قبل از وقت میر صاحب نے حاضرین کو حزب الطالبین کی ابتدا کرنے کی اطلاع دیدی تھی اور نوروز کے دن مجلسِ عزا کی بجائے محفلِ میلاد منعقد ہونا طے پایا تھا۔ محفل کا وقت بھی تحویلِ آفتاب سے قبل تھا۔ میر صاحب ٹھیک وقت پر تشریف لائے۔ جلدی جلدی اپنے بیگ میں سے اپنے ہاتھ سے تحریر کئے ہوئے حزب الطالبین کے فارم نکالے۔ اس وقت چار، پانچ افراد ہی حاضر تھے، انہوں نے فارم مطالعہ کرنے کے بعد بخوشی حزب الطالبین کا رکن ہونا قبول کرتے ہوئے فارم پر دستخط کر دیئے۔ یہ فارم حضرت نے اپنے بیگ میں رکھ لئے اور محفلِ میلاد کی ابتدا ہوئی۔ محفل کے بعد لوگ کھانا کھا کر واپس چلے گئے۔ یہ امر تعجب خیز ہے کہ سرکار نے یہ فارم اس مخصوص وقت کے گذرنے کے بعد اپنی حیات کے آخری دن تک پھر کسی کو پیش نہیں کئے اور نہ ہی کسی موقع پر ان

فارموں کا ذکر کسی زبان پر آیا حتیٰ کہ سرکار کا وصال ہو گیا۔ الحمدللہ راقم حزب الطالبین کے اراکین میں شامل ہے۔ دستخط کنندگان ایک ایک کر کے مقررہ وقت پر اس دارِفانی سے کوچ کر چکے صرف یہ حقیر پر تقصیر ابھی تک موجود ہے۔

چھوٹے چھوٹے واقعات تو اکثر پیش آیا ہی کرتے تھے۔ جن دنوں ''انوارالایقان'' اور ''جامع الانوار'' لکھی جارہی تھی تو اس کی طباعت کا بندوبست بھی ہو رہا تھا، کاتب کی خدمات حاصل کر لی گئی تھیں۔ اس کی پروف ریڈنگ راقم کے ذمہ تھی، میں اپنے دفتر میں فرصت کے وقت پروف ریڈنگ کرتا رہتا تھا، ایک دن میرے ایک دفتر کے ساتھی جو کہ کارپینٹر تھے۔ اُن کا نام تھا سبطِ حسن، لیکن لوگ انہیں بابو خان کہہ کر پکارتے تھے، کچھ عبادات کا بھی انہیں شوق تھا، تسبیح اکثر ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی، مجھے پروف ریڈنگ میں مصروف دیکھ کر وہ میری میز پر کھڑے ہو گئے۔ دیکھتے رہے، پھر سوال کیا کہ آپ یہ کیا کام کر رہے ہیں، انہوں نے دو تین صفحے پڑھے تو متاثر ہوئے اور فرمائش کی کہ مجھے اُن بزرگوار سے ملوا دیں۔ میں نے جواباً انہیں بتا دیا کہ ہفتہ کے دن مغرب کے بعد ہاکی گراونڈ میں اصغر علی صاحب کے گھر پر مجلس ہوتی ہے۔ تم میرے ساتھ چلے چلنا۔ ہفتہ کا دن آیا۔ اس نے مجھے کہا کہ میں لیاقت آباد ڈاکخانے کے بس اسٹاپ پر ایرانی کے ہوٹل میں آپ کا انتظار کروں گا، میں وقتِ مقررہ سے ذرا پہلے ہی ہوٹل پہنچ گیا۔ بیٹھا رہا، بیٹھا رہا، وقت تنگ ہو رہا تھا وہ نہیں آیا تو میں مجبوراً اکیلا ہی مجلس میں شریک ہونے کے لئے چلا گیا۔ اگلے روز بابو خان نے معذرت کی کہ گھر جا کر معلوم ہوا کہ بچے کو شدید بخار ہے ڈاکٹر کا وقت بھی وہی تھا جو مجلس کا تھا، ڈاکٹر کے یہاں دیر ہو گئی میں پہنچ نہیں سکا۔ اگلے ہفتہ پھر ہم دونوں میں عہد و پیمان ہوئے۔ میں قبل از وقت اُسی مقام پر پہنچا اور انتظار کے بعد پھر اکیلا ہی گیا۔ دفتر میں ملاقات ہوئی تو بتایا کہ خیر پور سے میرے بہت قریبی عزیز آگئے تھے، جن کی آمد کا مجھے پہلے سے علم نہیں تھا۔ ان کی وجہ سے میں گھر سے نکل ہی نہیں سکا۔ تیسرے ہفتہ پھر یہی ہوا

کہ وہ غیر حاضر رہے، اب یہ معاملہ میں نے مجلس کے بعد حضرت میؔر صاحب کی خدمت میں
پیش کیا، واقعات سن کر نہایت جلال کے عالم میں فرمایا، کیوں آنا چاہتا ہے وہ میرے پاس میں
نے مجمع تو اپنے گرد اکٹھا نہیں کرنا، کوئی ضرورت نہیں اس کے آنے کی۔ تعجب کا مقام ہے کہ
تیسرے ہفتہ کے بعد بابو خان نے نہ پھر کبھی فرمائش کی اور نہ ہی کوئی عذر اپنے تیسری مرتبہ نہ
آنے کا کیا، جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

ایک واقعہ مجھے ایک ہندو کا میؔر صاحب نے سنایا تھا کہ وہ (ہندو) امام حسین علیہ السّلام
کے مصائب کا اکثر ذکر سنتا تھا۔ کتابوں کا مطالعہ کر کے معرفتِ حسین علیہ السّلام اسے حاصل
تھی۔ اس کا جب انتقال ہوا تو جنازہ مقررہ مردہ گھاٹ (شمشام گھاٹ) لے جایا گیا وہاں ہندو
مذہب کے رواج کے مطابق میت کو جلانے کے لئے چتا میں رکھ کر آگ جلا دی گئی۔ جس سے
اس کا پورا جسم جل کر راکھ بن گیا لیکن اس کا سر بالکل سالم رہا اس پر آگ کا بالکل اثر نہیں ہوا۔
یہ صورت حال اس کے بیٹے کے لئے جو کہ وارث تھا پریشان کن تھی، وہ بھاگا ہوا مرحوم کے
ایک دوست سید صاحب کے پاس گیا۔ اور اُن سے ذکر کیا کہ میرے والد کا سر جلنے سے رہ
گیا جب کہ پورا جسم جل کر خاک ہو چکا۔ مجھے آپ مشورہ دیں کہ اس کا تدارک کیسے ہو،
سیّد صاحب خود بزرگ تھے ذاکرِ حسینؑ بھی تھے۔ متوفی نے ذکرِ حسینؑ کرنا ان کی ہی صحبت
میں رہ کے سیکھا تھا۔ سیّد صاحب نے فرمایا کہ اس کی زبان پر زندگی میں ذکرِ حسینؑ جاری رہتا
تھا لہٰذا اس کے سر کو آگ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکی انہوں نے مشورہ دیا کہ ایک گڑھا کھود کر
اِن کا سر دفن کر دیا جائے۔

ایک واقعہ خصوصی توجہ کا حامل ہے۔ ہوا یوں کہ جناب سید مرغوب صاحب (مرحوم) نے
کراچی کی ہاؤسنگ سوسائٹی میں اپنے ذاتی پلاٹ پر اپنا رہائشی مکان تعمیر کرنے کا پروگرام بنایا۔
اس مقصد کی تعمیل میں انہوں نے ابتدا میؔر صاحب سے کرانا پسند کیا۔ میر صاحب نے رضامندی

ظاہر فرمائی تو مرغوب صاحب نے مجھے اور اپنے قریبی دوست قیصر حسین صاحب کو بھی مدعو کیا۔ ہم صرف چار اشخاص تھے جب مکان کی بنیاد رکھی گئی۔ اس موقعے پر مرغوب صاحب نے میر صاحب سے استدعا کی کہ وہ کچھ بیان فرمائیں۔ میر صاحب نے جواباً فرمایا کہ پہلے مرغوب صاحب آپ ہی ابتدا کریں۔ چنانچہ مرغوب احمد صاحب (مرحوم) ومغفور نے حدیث کساء کی تلاوت فرمائی، پھر فرمائش کی کہ میر صاحب اب آپ کچھ بیان کیجئے۔ میر صاحب نے پہلے عربی میں سورہ مزمل کے دوسرے رکوع کی تلاوت فرمائی۔ پھر اردو میں آیات مذکورہ کے ایک ایک جملے کا تفصیلی ذکر کیا یہ پورا مرثیہ تھا امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا، جس میں شب عاشور، یومِ عاشور اور شامِ غریباں، اسیری اور بے ردائی مخدراتِ عصمت وطہارت کا ذکر سن کر کم از کم میں تعجب میں تھا کہ ہم اکثر اس سورہ کی تلاوت کیا کرتے ہیں، لیکن یہ مفہوم آج ہی معلوم ہوا۔ موصوف اور ہم بکاء علی الحسینؑ کرتے رہے۔ میر صاحب پر اس قدر گریہ طاری ہوا کہ خاتمہ کے بعد بھی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

ایک مرتبہ مجھ گہنگار پر کرم ہوا۔ میں نے خواب میں زیارت کی اور مجھے اس حالت میں تین حروف دکھائے گئے جو الف، بے، تے (ا،ب،ت) تھے میں اگلے روز حضرت کی قیام گاہ پر گیا، سلام کے بعد میں نے خواب کا ذکر صرف ایک سوال کر کے کیا۔ میں نے دریافت کیا کہ میر صاحب کیا (ا،ب،ت) بھی کچھ ہوتے ہیں میں نے خواب میں یہ تین حروف دیکھے ہیں انھوں نے فوراً کہا کہ ہاں ہاں یہ ہوتے ہیں۔ میں نے دوسرا سوال کر دیا کہ یہ کیا ہوتے ہیں، تو خاموش رہے پھر کہنے لگے بھئی مجھ سے کیوں پوچھتے ہو کہ یہ کیا ہوتے ہیں۔ جس نے آپ کو یہ حروف دکھائے ہیں وہی تمہیں اس کا مطلب بھی سمجھائیں گے، خوش قسمتی سے ایسا ہی ہوا کوئی پندرہ بیس دن کے بعد دوبارہ کرم ہوا اور مجھے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسمِ اعظم دکھا دیا گیا، میرے لئے لازم ہوا کہ اپنے مرشد سے اسکا ذکر کروں، میں نے اگلے ہی دن پھر حاضری دی

اور اس اسمِ اعظم کا ذکر کیا، سنتے ہی فوراً فرمایا یہی تو (ا، ب، ت) ہے۔ اس کو پڑھو، الحمدللہ یہ ذکر میں کرتا رہتا ہوں۔

تقسیم ہندوستان سے قبل میر صاحب اعلی اللہ مقامہ فوج میں ملازم تھے۔ اور (M. E. S) کے شعبہ سے تعلق تھا۔ اس لحاظ سے ان کی انجیئر نگ کے شعبے میں دلچسپی بہت تھی۔ علم ہندسہ سے خاص شغف تھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ تنہائی میں اکثر الجبرا اور حساب کے سوالات حل کرتے تھے، ایک مرتبہ سرکار نے انکشاف کیا کہ زمین سے چاند کا فاصلہ انہوں نے ۱۹۴۲ء سے پہلے ہی معلوم کر لیا تھا، جب کہ اس زمانے میں کسی کو اس طرف تحقیق و تجسس کرنے کا خیال تک نہ تھا۔ بعد از جنگ عظیم دوم امریکی سائنسدانوں نے اس مسئلہ پر توجہ دی اور جو کچھ بھی ان کے اعداد و شمار کے مطابق فاصلہ معلوم ہوا وہ حرف بحرف وہی ہے جو میر صاحب نے نکالا تھا۔ اس تحقیق کا ذکر میر صاحب نے اپنی کتاب ''انوار الایقان'' میں بھی کر دیا ہے۔ آپ علم الحروف اور علم الاعداد سے بھی کما حقہٗ آگاہ تھے۔

سیّد ظفر الحسن زیدی



بسمہٗ

شبیر بلگرامی صاحب

اسلام آباد۔ ۱۸ ستمبر ۲۰۰۶ء بروز پیر۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں ریلوے اسکول میں ملازم تھا جو بعد میں ایبٹ آباد پبلک اسکول بنا۔ میں ہاؤس ماسٹر بھی تھا۔ میرے ہاؤس میں مرزا مطلوب نام کے ایک طالب علم تھے۔ ان کے والد پاکستان ریلوے میں افسر تھے۔ ان کا دفتر ریلوے ہیڈ کواٹر لاہور میں تھا۔ اس وقت میری رہائش لاہور میں تھی۔ ایک سال گرمیوں کی چھٹیوں میں آیا تو مرزا صاحب سے ملنے ان کے دفتر گیا۔ بیٹھے تھے۔ سوٹ اور ٹائی میں تھے پیشانی پر سجدہ کا نشان تھا۔ میں نے کہا ''مرزا صاحب! دل بہت پریشان رہتا ہے۔ کسی طرح چین نہیں آتا۔ کیا کروں۔ کوئی وظیفہ بتایئے۔ کیا پڑھوں؟'' کہنے لگے ''وہی وظیفہ کیوں نہیں کرتے جو اللہ کر رہا ہے''۔ بات دل کو لگی کہ اللہ اور اُس کے فرشتے نبی کریم صلعم پر درود بھیجتے ہیں۔ ایمان والو تم بھی بھیجو اور تسلیم کرو۔

دورانِ گفتگو اُن کی دوسری بات جو اچھی لگی یہ تھی کہ ''بدن کا وضو تو پانی سے ہوتا ہے مگر روح کا وضو آنسوؤں سے ہوتا ہے''۔ یہ ذکر میں نے صرف اس لئے کیا ہے کہ میر صاحب کے پاس پہنچنے سے بہت پہلے دل بے چین تھا اور سکون کی تلاش تھی۔

وقت گذرا۔ ایبٹ آباد سے کراچی آیا۔ موجودہ مسرور بیس کے اسکول میں پرنسپل رہا۔ وہاں سے بہ حیثیت پرنسپل حبیب پبلک اسکول آیا۔ اُس وقت کتابیں پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ اسکول میں دو بھائی شبیر اور معصوم پڑھتے تھے۔ دونوں ہاکی کے اچھے کھلاڑی تھے۔ اسکول کی ہاکی ٹیم میں بھی تھے۔ اسکول میں شام ۴ سے ۵ بجے تک کھیل ہوتے تھے۔ ان کے والد میجر اصغر تھے جو انہیں لینے آتے تھے۔ میری اُن سے صاحب سلامت ہوگئی تھی۔ ایک دن جب وہ آئے تو میں نے کہا ''میجر صاحب آپ کی کوئی لائبریری ضرور ہوگی۔ کوئی اچھی سی کتاب جو آپ نے

پڑھی ہو مجھے بھی دیجئے''۔ اگلے دن انھوں نے شیر کے ہاتھ ''اسلام کا پہلا کلمہ'' بھیج دیا۔ وہ مختصر سا کتابچہ تھا جسے میں نے بیٹھے بیٹھے پڑھ لیا۔ اس کے مندرجات دل نشیں ہو گئے سادہ اور سامنے کے تھے مگر آج تک نہ ان کی طرف کسی نے توجہ ولائی تھی نہ خود توجہ ہوئی تھی۔ مثلاً جو کچھ دیکھا۔ سنا۔ سونگھا۔ چھوا اور چکھا سب اپنے اندر ہے۔ مطالعہ کے فوراً بعد ساتویں یا آٹھویں جماعت میں معلوماتِ عامہ (جنرل نالج) کا میرا ایک پیریڈ تھا۔ میں نے ان مندرجات کا ذکر وہاں کیا تو طلباء کے چہرے کِھل گئے۔ میں نے شیر سے کہا کہ میجر صاحب سے کہو کہ اُسی مصنّف کی اور کتابیں ہوں تو بھیج دیں۔ انھوں نے کہلا بھیجا کہ مصنّف یہیں ہیں۔ چاہیں تو آکر مل لیں۔ مگر دنیاوی مصروفیات کی وجہ سے جانے میں دیر ہوتی گئی۔ اس عرصہ میں میجر صاحب نے فون پر پوچھا کہ کتاب کیسی ہے؟ میں نے کہا فکر انگیز ہے۔ دن گذرتے گئے۔ میجر صاحب نے پھر کہا کہ مصنّف صاحب پوچھ رہے تھے ''کیا ہیڈ ماسٹر صاحب کا کوئی فون آیا؟'' مگر میں حبیب پبلک اسکول کی پرنسپلی کے نشہ میں فرعونِ بے سامان بنا پھرتا رہا اور نہ گیا۔ یہاں تک کہ ایک دن میجر صاحب نے فون پر کہا کہ ''چراغِ سحری ہیں۔ ملنا ہے تو آکر مل لیں''۔ اب ہوش آیا۔ ان دنوں ہاکی اسٹیڈیم کا چارج میجر صاحب کے پاس تھا۔ مِیر صاحب وہیں ایک کمرے میں مقیم تھے۔ گیا۔ رات کا وقت تھا۔ کمرے میں اور لوگ بھی تھے۔ مِیر صاحب ایک کرسی پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ میں بھی نیچے قالین پر بیٹھ گیا۔ میجر صاحب میرے ساتھ بیٹھے تھے۔ میں مِیر صاحب سے باتیں کرنے لگا۔ دورانِ گفتگو میں انھیں کبھی ''قبلہ'' اور کبھی ''کعبہ'' کہتا تھا۔ سنتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگے ''میں نہ قبلہ ہوں نہ کعبہ''۔ میجر صاحب نے کہا ''مِیر صاحب کہیے''۔

اس وقت مِیر صاحب نے مجھ سے ڈیڑھ یا دو منٹ بات کی۔ یہ بالکل یاد نہیں ہے کہ کیا کہا مگر اُس کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور یہ بالکل بھول گیا کہ کمرے میں اور

لوگ بھی موجود ہیں اور میں حبیب پبلک اسکول کا پرنسپل ہوں۔ اُس مختصر گفتگو سے میرے روایتی مذہب کی عمارت مسمار ہوگئی تھی اور خلاء پیدا ہو گیا تھا۔ میں یہ سوچ کر رو رہا تھا کہ اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر ایسے میں موت آ گئی تو کیا ہوگا۔ وہ بیٹھے رہے۔ میں روتا رہا۔ روتے روتے ہی بیٹھے بیٹھے پیچھے ہٹا اور سرکتے ہوئے سامنے دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلا رہے ہیں۔ میں بیٹھے بیٹھے ہی سرکتا ہوا کرسی تک گیا۔ کہنے لگے:

لنما چہ کنم ے تولا

شُد است بزوں فتد زمینا

اُس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ کس کا شعر ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ علی الاعلیٰ کی شان میں کہی ہوئی اقبالؔ کی اُس منقبت کا شعر ہے جسے وہ پڑھا کرتے تھے۔ اب اس منقبت کا فارسی متن مع منظوم اردو ترجمہ کے اورادالطالبین میں درج ہے۔

یہ میرؔ صاحب کی خدمت میں ہاکی گراونڈ پر میری پہلی حاضری تھی۔ ابتدا ہی میں تین باتیں کہی تھیں۔ (۱) منہ بند رہے گا۔ (۲) میرے پاس آنا تو دنیا کی جوتی باہر اُتار کر آنا۔ (۳) گھر والی سے فساد کیلئے تیار رہنا۔ کبھی کبھی انگریزی میں کسی اقتباس کو زبانی سنایا کرتے تھے جس کا خلاصہ یہ تھا کہ زنِ خانہ ایک بھٹی ہے جس سے ہو کر مرد کندن بن کر نکلتا ہے۔ اس کے بعد میرؔ صاحب کے پاس تقریباً روزانہ' عموماً رات کو' حاضری ہونے لگی۔ زیادہ تر میں، کرنل مظفر ہمدانی اور میجر اصغر ہوتے تھے جو شاہ جی کہلاتے تھے۔

ایک دفعہ دن کو میرؔ صاحب کے پاس گیا۔ پہلے شاہ جی کے پاس ان کے دفتر گیا جو ساتھ ہی تھا۔ کہنے لگے ''کل تمہارے جانے کے بعد مجھ سے کہہ رہے تھے کہ تیس (۳۰) سال سے تلاش میں تھا''۔ اور یہ حق ہے۔ جہاں سنا کوئی ہے۔ پہنچ گیا۔ چاہے لاہور ہو یا لنڈی کوتل مگر دل کہیں

نہ بھرا۔ ہر جگہ عیاری اور دنیا داری دکھائی دی۔ شاہ جی کی اس اطلاع سے مجھے خیال آیا کہ جو میں (۳۰) سال پیچھے دیکھ سکتا ہے وہ میں (۳۰) سال آگے بھی دیکھ سکتا ہوگا۔ ویسے اپنا تعارف خود کبھی نہ کرایا۔ کہا کرتے تھے کہ "اگر خلوص سے مانگو گے تو یا تمہیں اُس تک لیجائے گا یا اُسے تم تک لے آئے گا"۔

ان دنوں کے چشم دید واقعات اور براہ راست میر صاحب سے سنے ہوئے ارشادات بلا ترتیب یہ ہیں:۔

☆ میر صاحب کی چودہ (۱۴) تصنیفات ہیں۔ ان میں کسی میں بھی یہ حوالہ نہیں ہے کہ کس کتاب کو تصنیف کرنے میں کن کن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ بلکہ مشعلِ نور میں لکھا ہے کہ "وحکم مولا کا جو پہنچا سو قلم بند ہوا"۔ تو کیا یہ الہامی نظم ہے؟ اور کیا دیگر تصانیف اکتسابی علم سے لکھی گئی کتابوں کی مرہون نہیں ہیں؟ شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ نہیں ہیں۔

☆ دن تاریخ تو یاد نہیں مگر اوائل کی بات ہے کہ ایک دن مجھ سے کہا کہ مولائے کائنات کے تخلیقِ کائنات پر خطبہ کا انگریزی میں ترجمہ کر کے لائیں۔ اگر چہ ہم اپنی بے بصیرتی کی وجہ سے میر صاحب کی عرفانی منزل و مقام سے اُس وقت بھی واقف نہیں تھے اور اب ۳۰۔ ۳۵ سال بعد بھی کما حقہ، واقف نہیں ہیں مگر اُس وقت بھی اتنا ضرور تھا کہ اُن کے کسی حکم کو ٹال سکتے تھے نہ کسی بات کو منع کر سکتے تھے۔ چنانچہ یہ بات بھی خاموشی سے مان تو لی مگر یہ خیال ضرور آیا کہ جس خطبہ کو مادری زبان میں ایک بار پڑھکر سمجھنا مشکل ہے اس کا ترجمہ غیر مادری زبان میں خصوصاً وہ بندہ کیوں کر کر پائے گا جو میٹرک تک اردو میڈیم سے پڑھا ہو۔ بہر حال گھر آیا۔ اُن دنوں حبیب اسکول کی طرف سے جامع امامیہ کے قریب زہرا اقبال صاحبہ کے گھر میں کرایہ پر رہتا تھا۔ اس مکان کی دو منزلیں تھیں۔ دوسری منزل کی چھت پر کھلے آسمان تلے ایک پرانی مسہری پڑی تھی۔ اُس پر روئی کا ایک پرانا گدہ پڑا تھا جو اوس اور دھوپ سے گل گیا تھا۔ اُس کے

بیچ میں گڈھا ہو گیا تھا۔ دن کا وقت تھا۔ دھوپ تھی۔ میں خطبہ اور کاغذ پنسل لیکر اس گڈھے میں بیٹھ گیا۔ تنہائی تھی۔ سناٹا تھا۔ کاغذ پنسل رکھدی اور بڑے خلوص سے ہاتھ جوڑ کر اپنی کم علمی اور مجبوری کے احساس کے ساتھ مولاً امامِ زمانہ علیہ الصلوٰۃ کو سلام کر کے بند ہونٹوں کے ساتھ دل سے عرض کی کہ مولا کریم یہ میرا کام نہیں ہے۔ میں نہیں کر سکتا۔ آپ مدد کیجئے۔ اور وہ ترجمہ مکمل ہوا۔ لیجا کر میرؔ صاحب کو سنایا۔ انھوں نے پسند کیا اور شاید راجہ صاحب محمود آباد کو لندن بھیجا۔ ترجمہ کی کوئی کاپی شاید کہیں ہو۔

☆ برسوں بعد میرؔ صاحب کی ''انوارالایقان'' کا انگریزی ترجمہ کرتے ہوئے ڈیڑھ سال کے عرصہ میں بہت سے مقامات آئے جہاں میں زچ ہو گیا اور میری عقل و علم نے جواب دیدیا تو میں نے یہی عمل کیا۔ قلم رکھ دیا۔ ہاتھ جوڑ کر سر جھکا دیا اور عرض کی کہ مولاً مدد! اور مدد ہوئی۔ الحمدللہ۔ (یہ صرف اس لئے لکھا کہ آپ بھی رجوع کریں۔)

☆ سردیاں تھیں۔ ایک روز گیا تو دھوپ میں باہر آنکھیں بند کئے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ کرنل ہمدانی پہلے سے بیٹھے تھے۔ میں پہنچا تو انھوں نے میرؔ صاحب سے تفریحاً کہا ''نیل گرامی صاحب آگئے ہیں'' وہ آنکھیں بند کئے بیٹھے رہے۔ پھر کہا ''نیل گرامی صاحب آگئے ہیں''۔ کہنے لگے'' کچھ بھی ہیں گرامی تو ہیں''۔

☆ ایک دن گیا تو اندر کمرے میں اکیلے بیٹھے تھے۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں مڑی تو تھیں ہی۔ درد کی تکلیف کا اثر چہرے سے ظاہر تھا۔ میں نے دبانا شروع کیا اور دیر بعد جب دباتے دباتے اُلٹے بکھورے پر پہنچا تو اکدم بولے ''یہی ہے یہی ہے''۔ میں نے اس جگہ کو مسلسل دبانا شروع کیا۔ جب درد کی تکلیف دور ہو گئی اور چہرہ پر سکون ہو گیا تو میں نے دبانا چھوڑ دیا اور ہاتھ ہٹالیا۔ کہنے لگے۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق
لبِ ساقی پہ مکرر ہے صلا میرے بعد

☆ ایک روز رات کی ڈیوٹی پر تھا۔ صوفہ پر لیٹے تھے۔ کنارہ پر بیٹھا ہوا میں پیر دبا رہا تھا۔ جب رات بھیگی تو نیند کا غلبہ ہوا۔ اونگھ آ گئی اور میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ فوراً اتنی زور سے پچھ کہا کہ میں صوفہ سے نیچے گر پڑا۔

☆ میر صاحب کیلئے ایک چار پائی کی ضرورت تھی۔ ایک صاحب تھے انھوں نے روپے لے لئے اور کہا چار پائی ہم لا دیں گے مگر روپے کھا گئے اور چار پائی نہیں لائے۔ ایک دن سامنے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ سانس رُک گئی۔ شاہ جی نے جو پاس بیٹھے تھے گھبرا کر کہا ''میر صاحب ان کا دَم بند ہو گیا ہے''۔ کہا ''ہاتھ سینہ پر پھرایئے''۔ پھرایا۔ سانس بحال ہو گئی تو اُن صاحب سے کہا ''مقامِ مولاؑ پہچان''۔

☆ رات کو میر صاحب کے ساتھ رہنے کیلئے ایک صاحب کو رکھا گیا تھا۔ ضعیف العمر تھے۔ موٹے شیشہ کی عینک لگاتے تھے۔ ایک دن میں اور شاہ جی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میر صاحب بستر پر لیٹے ہوئے تھے کہ یہی ملازم صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور آتے ہی کہا ''ارے یہ یہاں لیٹے ہوئے ہیں''۔ ہم میں سے کسی نے کہا ''یہ تو دیر سے لیٹے ہوئے ہیں کیا بات ہے؟'' انھوں نے کہا ''میں اپنے گھر گولیمار سے یہاں آنے کیلئے بس پر سوار ہوا۔ ایک پیر ابھی نیچے ہی تھا کہ اُس نے بس چلا دی۔ میں گر گیا۔ پہیہ مجھ پر چڑھ جاتا مگر انھوں نے اٹھا کر اندر رکھ دیا۔ اب یہاں لیٹے ہوئے ہیں''۔

☆ ایک دن کمرے میں میر صاحب تھے اور میں تھا۔ کرسی پر بیٹھے تھے۔ حسبِ معمول میں پیر دبا رہا تھا۔ کوئی بات چیت نہیں ہو رہی تھی۔ سناٹا تھا کہ دفعتاً کہنے لگے ''برتن نہیں آئے''۔ میں نے جھک کر کرسی کے نیچے دیکھا۔ اِدھر اُدھر کونوں میں نظر کی۔ میں سمجھا اندر سے طشت میں

جس پیالے میں کھانے کا ولیا آتا ہے اس کو پوچھ رہے ہیں۔ میں نے کہا "میر صاحب برتن نہیں ہیں"۔ انھوں نے کچھ نہ کہا اور چپ رہے۔ وہ تو جب لاہور سے بابا سید صدا حسین صاحب آئے اور اُن کا منہ ان کے کان سے اور ان کا منہ اُن کے کان سے ایک منٹ کیلئے ملکر جدا ہوا اور بابا صدا حسین نے کہا "نور کا ایک سمندر ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ میں تو یہاں تک (اشارے سے گلے تک) بھر گیا"۔ تب میں سمجھا کہ برتن یہ ہیں۔

☆ جب بابا پہلی دفعہ آئے تو مجلس ہو رہی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھا مجالس الصادقین پڑھ رہا تھا۔ ساتھ ہی کرسی پر میر صاحب بیٹھے تھے۔ مجلس کے بعد میں کرسی سے اٹھا کھڑا تھا کہ بابا اُٹھ کر میر صاحب کے پاس آئے۔ میر صاحب نے کہا "آپ کو تقرب حاصل ہے۔ آپ اس امر (بربر) پر مامور ہیں۔ (میری طرف اشارہ کر کے) ان کیلئے دعا کر دیجئے انھوں نے اہلِ بیت کی بہت خدمت کی ہے"۔ احباب بہت دنوں تک یہی سوچتے رہے کہ اس نے آلِ پاک کی کون سی خدمت کی ہے؟ یہ دراصل اشارہ اللہ کے نور کے بیت کا اہل ہونے کی جانب یعنی اپنی طرف تھا۔

☆ ایک دن میں نے کہا "میر صاحب! کوئی آدمی کچھ کہے اور یہ نہ سمجھے کہ کیا کہہ رہا ہے تو ایسی بات تو مہمل ہے۔ میں سجدہ میں جب سبحان ربی الاعلیٰ کہوں تو اپنے دماغ کی سوئی کس کی طرف لے جاؤں؟"۔ کہنے لگے "اُس کی طرف جو دل میں ہے"۔ دل میں تو کربلا ہے۔ اب برسوں بعد یہ ایمان آیا ہے کہ کربلا کے حوالہ کے بغیر خیال کی یکسوئی اور مرکزیت ممکن نہیں ہے۔ ذہن انسانی جو بھی سوچتا ہے اسے خلق کرتا ہے۔ ذات باری کو سوچے گا تو کچھ نہ کچھ بنالے گا۔ خود خالق ہو گا وہ مخلوق۔ اور اس سے بڑا شرک اور کیا ہو گا۔ میں تو ہر رکوع اور سجدے میں ربی العظیم اور ربی الاعلیٰ کے بعد ربِّ صلّ علیٰ محمدٍ و آلِ محمدٍ اور اس کے بعد سبحان اللہ یا حسینؑ کہتا ہوں یعنی جسے انھوں نے سجدہ کیا میں بھی اسی کو سجدہ کرتا

www.TaabeerMurtaza.ml

ہوں۔

☆ بابا صدا حسین صاحب نے مجھ سے کہا "میر صاحب کو خواب میں دیکھنا کیا کوئی معمولی بات ہے"۔

☆ ایک دن میں نے "اے سر بریدہ قاریٔ قرآن" والا سلام جو مجالس الصادقین میں ہے بغیر میؔر صاحب کو سنائے اور بغیر اُن کی اجازت کے مجلس کے اختتام پر پڑھ دیا۔ شکر ہے مجلس کے بعد جب تبرک کھلا رہا تھا تو فرمایا "سلام اچھا ہے"۔

☆ مجھ سے کہا "ہاشمی سرمہ والے کے یہاں لے چلیں۔ اسٹیڈیم کے باہر گاڑی کھڑی تھی۔ آئے۔ بیٹھے۔ ایک صاحب نے رخصت کرتے ہوئے کہا "علیؑ مولا میؔر صاحب!" کہنے لگے "آپ منافق ہیں"۔

☆ مجلس کی بات ہو رہی تھی کہ ہونی چاہیے۔ کہنے لگے "کوشش تو کی تھی۔ کوئی آیا ہی نہیں"۔ کسی نے کہا "کون پڑھے گا؟ کرنل صاحب نے کہہ دیا "بلگرامیؔ"۔ میؔر صاحب نے "ہاں" کر دیا۔ میں نے اس سے پہلے مجلس نہیں پڑھی تھی۔ جب سے پڑھ رہا ہوں۔ ۳۰،۳۵ سال تو ہو گئے ہوں گے۔ میؔر صاحب ہی کا کلام پڑھا جاتا ہے۔ سامعین کہتے ہیں کبھی پرانا نہیں ہوتا۔

☆ ہر مجلس سے پہلے مجلس میں پڑھا جانے والا حصہ گھر پر پڑھتا ہوں۔ اقتدار صاحب (مرحوم) کے یہاں "انوار الایقان" پڑھی جا رہی تھی۔ گھر پر پڑھتے ہوئے ایک پیراگراف کے متعلق خیال آیا کہ اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے جب مجلس پڑھوں گا تو اسے حذف کر دوں گا۔ دورانِ مجلس جب اُس پیرے پر پہنچا اور اسے حذف کرنا چاہا تو کسی نے اندر انگریزی میں واضح طور سے کہا "Who has authorised you to omit it" میں نے اسے پڑھ دیا۔ ایک جعفری صاحب تھے۔ وہ مجلس میں آیا کرتے تھے۔ اِس مجلس میں بھی موجود تھے۔ مجلس کے بعد

وہ میرے ساتھ گاڑی میں موتی محل تک آتے تھے وہاں سے کسی سواری پر اپنے گھر جاتے تھے۔ اس دن واپس آتے ہوئے انھوں نے راستہ میں مجھ سے کہا کہ ''بہت دنوں سے ایک سوال میرے ذہن میں گھوم رہا تھا آج کی مجلس میں اُس کا جواب مل گیا''۔ وہ جواب اُسی پیرے میں تھا۔

☆ ایک صاحب میؔر صاحب کے پاس آیا کرتے تھے۔ دفعتاً غائب ہوگئے۔ کافی دنوں کے بعد آئے تو میؔر صاحب نے پوچھا'' کہاں تھے؟'' انھوں نے کہا ''زیارات پر گیا تھا'' میؔر صاحب نے کہا'' کیا بلایا تھا''؟۔

☆ میؔر صاحب بہت بیمار تھے۔ پیشاب بند تھا۔ پیروں پر ورم تھا۔ نزلہ تھا۔ ناک بہہ رہی تھی۔ چھینکیں آرہی تھیں۔ فالج تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں مڑ گئی تھیں۔ شدید قبض تھا۔ ڈاکٹر دانش کا علاج تھا۔ وہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے۔ میؔر صاحب کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ آج جو دوا فائدہ کرتی تھی اگلے دن وہ بے اثر ہو جاتی تھی۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر دانش نے عاجز آکر ایک دن بجائے دوا کے عام میٹھا سفوف پڑیوں میں بھیج دیا۔ میؔر صاحب کو کھلایا۔ کہنے لگے ''دوا تو اب آئی ہے''۔

☆ انھیں بیماریوں کا زور تھا کہ ایک دن جب میں آنے لگا تو فرمایا''ایک لیمو لیتے آیئے گا''۔ مجھے یاد ہے۔ بہت ڈھونڈا۔ کئی بازاوں میں دیکھا۔ کہیں نہ ملا۔ نایاب ہوگیا۔ آخر کار ناظم آباد کی گول مارکیٹ میں ایک ملا۔ میں لے کر جب پہنچا تو دروازے پر جیسے انتظار میں کھڑے ملے۔ تعجب ہوا کہ اتنا بیمار آدمی جیسے بیمار ہی نہیں تھا۔ لیمو کا شربت بنوا کر پیا۔ نزلہ زکام اور بڑھ گیا۔ حالت زیادہ خراب ہوگئی۔ اب جو سنتا دیکھنے کیلئے بھاگتا ہوا آتا۔ خیریت پوچھتا۔ پاس بیٹھتا۔ ہاتھ پیر دباتا۔ کچھ وقت دیتا۔ (دونوں کا کام ہوتا)۔

☆ عاشور کی رات تھی۔ کمرے میں کرنل ہمدانی تھے، میں تھا اور ایک صاحب تھے اُن کا

نام یاد نہیں ہے۔ میر صاحب حسب معمول لیٹے ہوئے تھے کہ دفعتاً کرنل صاحب نے کہا "میر صاحب ہمیں کچھ نہیں چاہئے"۔ پوچھا "کیا کہا؟" کہا "ہمیں کچھ نہیں چاہئے۔ صرف غمِ مولاً چاہئے"۔ کہا "مجھے اٹھا کر بٹھاؤ"۔ جب بٹھایا تو سیدھے بیٹھے۔ کمر میں خم نہیں تھا۔ اِنَّ اللّٰہَ اصطفیٰ آدم ۔۔۔۔۔ والی پوری آیت کی تلاوت کی۔ ہماری طرف دیکھا۔ دونوں آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں۔ ان میں بلا کا رُعب تھا۔ میں ان سے نظر نہ ملا سکا اور نگاہیں نیچی کر لیں۔ وہ آنکھیں پھر دیکھنے کو نہ ملیں۔

عارف کی زبانی اس آیت کی تلاوت ہم عاصیوں کی اُس وقت کی کیفیت نفسی کے حوالے سے ہمارے لئے بڑی سعادت تھی۔ (آیت ۳۳: آل عمران)۔

☆ جب حبیب اسکول میں ہوا بگڑی اور میری ملازمت ختم ہوئی تو اہل و عیال کی ذمہ داریوں کے احساس سے اور بیروزگاری سے عاجز ہو کر میں میر صاحب کے پاس گیا۔ کمرے میں صرف وہ تھے۔ حسب معمول کرسی پر سر جھکائے آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ میں نیچے فرش پر بیٹھ کر پیر دبانے لگا۔ پھر میں نے اپنی کہانی شروع کی کہ مجھ سے انتظامیہ نے بڑی زیادتی کی ہے۔ ملازمت ختم ہو گئی ہے۔ میرے بچے ہیں۔ ذمہ داریاں ہیں۔ بہت پریشان ہوں۔ کیا کروں۔ کس سے کہوں۔ کہاں جاؤں وغیرہ وغیرہ۔ میں اپنی پتا بیان کرتا رہا۔ وہ ویسے ہی سر جھکائے آنکھیں بند کئے بیٹھے رہے۔ کوئی بات نہ کی۔ نہ کچھ پوچھا۔ نہ کچھ کہا۔ مجھے خیال آیا کہ معلوم نہیں کچھ سنا بھی ہے کہ نہیں۔ میں چپ ہو گیا۔ پیر دباتا رہا۔

کچھ دنوں بعد حکومت نے حبیب بینک نیشنلائز کر دیا۔ میں یہ خبر لے کر میر صاحب کے پاس گیا۔ ویسے ہی سر جھکائے آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ میں نے کہا "میر صاحب حبیب بنک نیشنلائز ہو گیا"۔ مدھم آواز میں کہا "اب مزاج درست ہو گئے"۔

☆ ایک دن حسب معمول کرسی پر بیٹھے تھے۔ کوئی بات چیت نہیں ہو رہی تھی کہ اُس

سنانے میں اکدم کہا" یہ پڑھا کریں۔ یا علیؑ ادرکنی بحق الحسینؑ واصحابہ "ذَلِّل عَدُوَّنا"

☆ ہم لوگ کبھی کسی بات کیلئے میرؔ صاحب کو مخاطب کر کے ذرا زور سے پکارتے تھے اس لئے کہ وہ آنکھیں بند کئے سر جھکائے بیٹھے ہوتے تھے تو ہمارے "میرِ صاحب!" کہنے کے ۵۔۱۰ سکنڈ بعد جواب آتا تھا "جی"۔ اس سے ایسا لگتا تھا جیسے کہیں بہت دور تھے وہاں سے آئے ہیں۔

☆ ہاکی اسٹیڈیم میں میرؔ صاحب کے کمرے کے پیچھے کمروں میں شاہ جی اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک دن وہ اندر سے میرؔ صاحب کے کمرے میں آئے اور دوسرے دروازے کی طرف باہر جانے کیلئے جارہے تھے کہ میرؔ صاحب نے کہا "شاہ جی آپ کے نفس کی حالت اَب تک ٹھیک نہ ہوئی"۔ (معلوم نہیں اندرونِ خانہ کیا ہوا تھا)۔

☆ میرؔ صاحب کے پاس میں عموماً شام کو جاتا تھا۔ راستہ میں کرنل ہمدانی کو اُن کے گھر سے لیتا تھا۔ واپسی رات گئے ہوتی تھی۔ اُن کو چھوڑتا ہوا گھر آتا تھا۔ شروع میں جب پرانے نقوش کی جگہ میرؔ صاحب کے بیدار کُن افکار لے رہے تھے تو گویا ہر بات، ترجمہ، تفسیر غرض کہ ہر زاویہ ہمارے لئے نیا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ واپسی پر ہم دونوں ان کے گھر کے سامنے گاڑی میں بیٹھے ہوئے اُن باتوں پر تبصرہ کرتے تھے۔ باتیں اتنی ہوتی تھیں کہ کبھی کبھی نمازِ فجر کی اذان ہو جاتی تھی۔ ایک دن میر صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ کہنے لگے" بکواس بند نہ کی تو منتشر کر دیے جاؤ گے"۔

ہمدانی صاحب تو کراچی ہی میں رہے۔ مجھے مسقط جانا پڑا۔ وہاں پاکستان اسکول کھولا۔ ایک کمرے میں ۵ سال رہا۔ اس میں ایک پلنگ، ایک الماری، ایک میز اور ایک کرسی تھی۔ اہل و عیال کراچی ہی میں رہے اسلئے کہ وہاں ان کے رہنے کی جگہ نہیں تھی۔ جب تک رہا گھر کا پکا کھانا نہ ملا۔ پڑوس سے بگھار کی خوشبو آتی تھی تو دل مچلتا تھا۔ تنہائی میں بچے یاد آتے تھے۔ ایک بار بیمار

پڑا تھا تو کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔

مگر اِس قیدِ تنہائی اور جسمانی صعوبتوں میں قرآنِ حکیم کا جس توجہ اور یکسوئی خیال سے مطالعہ ہوا وہ پھر ممکن نہ ہوا اور آیات کے مفاہیم کا جو شعور حاصل ہوا وہ انھیں حالات میں ہوا۔ یہ سب میر صاحب کا کرم ہی تھا۔

دامن پہ کوئی داغ نہ شمشیر پہ دھبہ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو۔

☆ کرنل ہمدانی اپنی صاحبزادی کو جو کہیں باہر جارہی تھیں میر صاحب کے پاس لائے اور بتایا کہ یہ جارہی ہیں سلام کرنے آئی ہیں۔ میر صاحب نے کہا ''اِدھر لایئے۔ ہاتھ پر اسمِ اعظم لکھ دوں''۔ میں پاس ہی کھڑا تھا۔ میرے کان کھڑے ہوئے۔ ذرا اور قریب ہو گیا کہ دیکھوں کیا لکھتے ہیں۔ انھوں نے انگلی سے اُن کی ہتھیلی پر نقش کی شکل میں اسمِ اعظم لکھا۔ وہ مجھے یاد ہے۔ بتا اِس لئے نہیں سکتا کہ اُن سے اجازت نہیں لی۔ بہت دنوں بعد میں نے وہ نقش گرینڈ ہوٹل۔ ملیر۔ کراچی میں میرے ایبٹ آباد کے ملاقاتی موتی صاحب کے کمرے میں دیکھا۔ وہ اُس ہوٹل میں ملازم تھے۔ وہ نقش انھوں نے فریم کرا کے دیوار پر آویزاں کیا تھا۔ اُس پر ایک ہار پڑا ہوا تھا۔ وہ پارسی تھے۔

☆ خورشید صاحب کے گھر پر اُن کی اہلیہ مرحومہ کے شاید سوئم کی مجلس ہورہی تھی۔ میں مجالس الصادقین پڑھ رہا تھا۔ ساتھ ہی کرسی پر میر صاحب بیٹھے تھے۔ پڑھتے ہوئے معلوم نہیں کیوں مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا اور سر سے پیر تک کانپنے لگا۔ کانپتا رہا اور پڑھتا رہا۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں کیا پڑھا ہوگا اور لوگوں نے کیا سنا ہوگا۔ مجلس کے بعد میر صاحب نے مجھ سے کہا ''کیا پڑھا؟ اثر ہی اُلٹا ہو گیا''۔

☆ ہاکی اسٹیڈیم میں ہفتہ وار مجلس ہورہی تھی۔ میں پڑھ رہا تھا۔ ساتھ ہی خود بیٹھے تھے۔

دورانِ مجلس اچانک کہا۔ ''ہوں ہوں''۔ میں سمجھا شاید میں کچھ غلط پڑھ گیا۔ چپ ہو گیا۔ کہنے لگے'' جب۔۔۔۔۔۔ نے میدان میں پیٹھ دکھائی اور بھاگا تو دشمن نے پیچھا کیا اور سُرین میں نیزہ گڑوتے ہوئے کہا۔۔۔۔ آج کا دن یاد رکھنا۔ چھوڑ رہا ہوں''۔ یہ جو کچھ کہا کتاب میں نہیں لکھا تھا۔

☆ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میؔر صاحب کا قیام خورشید صاحب کے گھر تھا۔ اُس وقت اُن کی صحت ٹھیک تھی۔ ایک دفعہ میں گیا اور رات گئے تک بیٹھا اشعار سناتا رہا۔ وہ سنتے رہے۔ غلط پڑھتا تھا تو صحیح کر دیتے تھے۔ میں نے مصرع پڑھا'' بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش'' فوراً کہا ''پوشی''۔ اُس کے اگلے دن صبح کو میرے پاس حبیب اسکول فون آیا کہ میؔر صاحب پر فالج گر گیا ہے۔ میں فوراً گیا۔ باہر کرسی پر اکیلے بیٹھے تھے۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اندر کی طرف مُڑی ہوئی تھیں۔ میں یہ دیکھ کر اس خیال سے رونے لگا کہ عرصۂ دراز کے بعد ایک روشن ضمیر ملا تھا جس کی زبان پر قرآن کی آیات بولتی تھیں، جس نے کلامِ پاک میں کربلا کو دکھلایا تھا، جس نے بسم اللہ کا صحیح ترجمہ بتلایا تھا، جس نے لا الہ کا مفہوم سمجھایا تھا، وہ اَب اِس حال میں تھا۔ اگر چلا گیا تو پھر اندھیرا ہو جائے گا۔ اِس خیال سے میں ان کے سامنے بیٹھا روتا رہا۔ وہ دیکھتے رہے۔

وہ بھی عجیب دن تھے کہ راتوں کو صبح تک
میں تھا، تری جناب تھی، دستِ سوال تھا۔

جب صحت ٹھیک تھی تو بیمار کی عیادت کو جاتے تھے۔ خط کا جواب ضرور دیتے تھے۔ تبرک شوق سے کھاتے تھے۔ لیٹنے کے بعد نیچے کوئی شکن رہ جائے تو بے کل رہتے تھے تاوقتیکہ وہ ٹھیک کر دی جائے۔ سرمہ لگواتے تھے۔ واش روم سے آ کر سلیپروں کا رُخ اُسی طرف کر کے اتارتے تھے۔

اُن کی فالج زدہ انگلیاں سیدھی کرنے کی کوشش میں اتنی دیر تک اور مسلسل مالش کرتا تھا کہ گھر پہنچنے کے بعد بھی ہاتھوں سے ان کی باس آتی تھی۔

میرؔ صاحب کے متعلق کچھ ایسے مشاہدات ہیں جنھیں قلمبند کرنا اس لئے مناسب نہیں ہے کہ کہیں کوئی ''کھو'' نہ جائے۔

وقتاً فوقتاً ازخود کہا:

''پھر دیر کا ہے کی ہے''۔

''مجھے نیٹی جیٹی میں پھینک دو''۔

ہم سے کہا ''ایک رات کون دے گا؟'' (کسی نے حامی نہ بھری۔کوئی تیار نہ ہوا)۔

رخصت ہوتے وقت جب ہم کہتے تھے ''اجازت ہے میرؔ صاحب'' تو عموماً پوچھتے تھے ''پھر کب آیئے گا؟''۔

☆ شروع کی بات ہے۔ایک دن مجھ سے کہا ''مولاؑ (امامِؑ زمانہ) آئے اور مجھ سے کہا کہ میرے ساتھ چلو گے؟'' میں نے کہا ''میں تو تیار ہوں مگر میرے چچا (یا ماموں) ایسے آدمی ہیں کہ کہیں چھپوں گا ڈھونڈ نکالیں گے۔جیسے ہی میں نے یہ کہا ویسے ہی Cut۔(ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر کٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے مارا)۔۱۲سال گذر گئے''۔(یعنی مولاؑ نہ ملے)۔

☆ ایک بار کہا ''مجھے کہیں جانا تھا۔ٹرین کھڑی تھی۔میں کھڑکی پر گیا۔ٹکٹ لے کر جیب میں رکھا۔گیٹ پر ٹکٹ چیکر نے ٹکٹ مانگا۔میں نے دیکھا جیب میں ٹکٹ نہیں تھا۔شیروانی کی ہر جیب دیکھی۔کسی میں نہیں تھا۔میں پریشان ہوا۔ٹرین چلنے والی تھی۔پریشانی اور بڑھی تو میں نے دیکھا کہ مولاؑ سامنے کھڑے ٹکٹ دکھا رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں''۔

ع یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے۔

مذہبی معاملات میں مناظرے سے منع کرتے تھے۔

☆ ایک بار کہا کہ اگر کوئی ہوا میں الٹا لٹکا ہوا بھی ہو تو مرعوب نہ ہونا۔ اس کا مولاؑ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تربیت نفس سے ایسا ممکن ہے۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے منہ زبانی دوزخ پر مقرر ۱۹ آدمیوں کے نام گنوا ڈالے۔ ہم بے بصیرت تھے۔ نوٹ نہ کیے۔

میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ چاہے گھر پر کوئی بیمار ہو یا کوئی اور الجھن ہو جب تک میر صاحب کے کمرے میں اُن کے پاس ہوتا تھا سکون رہتا تھا۔ باہر نکلا اور مضطرب ہوا۔

پردہ کرنے سے ایک دن قبل میں گیا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ لیٹے ہوئے تھے۔ اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے پوچھا ''کیسی طبیعت ہے؟'' بلند آواز سے کہا ''کل سے تو بہت اچھا ہوں''۔ کچھ دیر بیٹھا پھر اجازت لی اور آ گیا۔

اُن دنوں کالا بورڈ پر کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ گرچہ ملازمت ختم ہو چکی تھی مگر اسکول کی گاڑی ابھی میرے پاس ہی تھی۔ وہ کئی دن سے پریشان کر رہی تھی۔ سوچا رضویہ چورنگی پر اپنے پرانے پٹرول پمپ پر سروس کرانے لیجاؤں گا۔ چنانچہ پہنچا۔ وہاں اپنا نمبر آنے تک انتظار کرنا پڑا۔ دیر لگی۔ اس دوران استنجے کی حاجت ہوئی۔ سوچا گاڑی کی سروس کے بعد رضویہ جا کر فارغ ہو لوں گا۔ سڑک سے امام بارگاہ کی طرف مڑا (یہ ۱۹۷۷ء کی بات ہے اُس زمانہ میں بارگاہ کے چاروں طرف لوہے کی سلاخوں سے بارگاہ کا احاطہ بنا ہوا تھا) تو باہر سے دیکھا کہ بارگاہ کے صحن میں کسی کی نمازِ جنازہ ہو رہی ہے۔ خیال آیا صرف چند لوگ ہیں۔ کوئی معمولی آدمی ہو گا۔ کون جائے۔ نکل چلتے ہیں۔ اندر کسی نے جیسے کہا ''اور اگر تیرے لئے کوئی یہی سوچے'' بس گاڑی اندر مُڑ گئی اور میں جلدی سے جا کر صف کے آخری آدمی کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ نماز کے بعد جب جنازہ اندر لیجانے لگے تو میں نے ساتھ والے آدمی سے پوچھا ''کس کی میت ہے؟'' انھوں نے کہا ''میر صاحب انتقال کر گئے''۔ یہ وہی صاحب تھے جو گولیمار سے آتے ہوئے بس

سے گر گئے تھے اور بقول اُن کے میر صاحب نے اٹھا کر اندر رکھ دیا تھا۔

بعد میں شاہ جی نے کہا کہ تمہارا کالا بورڈ کا پتہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ ہم مجبور تھے کہ کیسے خبر کریں۔ یہ بھی سوچتے تھے کہ اگر نمازِ جنازہ میں شرکت نہ ہوئی تو عمر بھر افسوس کرو گے۔

میر صاحب نے شرکت کرادی۔ یہ اُن کا کرم تھا۔

چہرہ دیکھا تو خسرو کا یہ شعر یاد آیا۔

گوری سووے سیج پر، مکھ پر ڈارو کیس
چل خسرو دیس آپنے، سانجھ بھئی چو دیس

شبیر بلگرامی



بسمہٗ

سبطِ اکبر رضوی صاحب

میں جرمنی سے انجینیرنگ مکمل کر کے پاکستان واپس آیا تو میری شادی ہوگئی تھوڑے عرصے بعد میری اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔ اُن دنوں میں تنہا رہا کرتا تھا۔ ایک دن والد صاحب مرحوم کے ایک دوست آئے اور کہنے لگے چلو تمھیں ایک بہت قابل اور نیک شخص سے ملاؤں۔ میں انکے ساتھ ہولیا۔ ہم ناظم آباد میں ایک مکان پر پہنچے وہاں خورشید صاحب کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ گھنٹی بجانے پر خورشید صاحب تشریف لائے اور ہمیں اندر لے گئے۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد انھوں نے کہا کہ وہ ہمیں ایک بزرگ سے جن کا نام سیّد شفاء احمد ہے ملائیں گے لیکن پہلے اُن کی کچھ کتابیں پڑھ لو۔ انھوں نے مجھے ایک کتابچہ "جہاد فی اللہ" دیا اور تاکید کی کہ اس کو غور سے پڑھوں۔ دو تین دن کے بعد کتاب پڑھ کر میں خورشید صاحب کے پاس پھر گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ اُن کی اہلیہ شدید علیل ہیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ مرغوب صاحب سے دوا لے کر آؤں جو میں لے آیا مگر اُن کی اہلیہ کی حالت اور خراب ہوگئی اور وہ چند دن کے اندر انتقال کر گئیں۔ اُن کے سوئم کی مجلس میں میؔر صاحب بھی تشریف لائے۔ اس طرح مجھے میؔر صاحب کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔

اس واقعہ کے دوسرے دن میں ہاکی اسٹیڈیم پہنچ گیا۔ میجر اصغر صاحب مرحوم مجھے ایک کمرہ میں لے گئے جہاں کچھ لوگ قالین پر بیٹھے ہوئے تھے اور دوسری طرف میؔر صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔

میجر صاحب نے مجھے میؔر صاحب سے ملوایا اور ساتھ والی کرسی پر بٹھا دیا۔ کیا باتیں ہوئیں کچھ یاد نہیں ہے۔ میں اَب تقریباً روزانہ شام کو چھ سات بجے ہاکی اسٹیڈیم جانے لگا۔ ساڑھے نو بجے واپس آتا تھا۔ ایک دن میں ساتھ والی کرسی پر بیٹھا ہوا میؔر صاحب کا بازو دبا رہا تھا کہ وہ

کہنے لگے کہ اگر اصل دین معلوم کرنا ہے تو بچوں سے معلوم کرو۔ میں نے کہا کہ وہ تو کچھ نہیں جانتے۔ اس پر میر صاحب کہنے لگے۔ یہی تو غلطی ہے بچے تو سب کچھ پڑھے ہوئے پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ مثالوں سے مجھے سمجھایا۔ میرے لئے یہ بالکل نئی بات تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد وہ بزرگ جو مجھے خورشید صاحب کے پاس لے گئے تھے میرے گھر آئے۔ میں نے میر صاحب کے بارے میں جو کچھ مجھے اس وقت تک معلوم ہوا تھا بیان کیا۔ انھیں بھی میر صاحب سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔ اگلے دن شام کو میرے ساتھ میر صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ میر صاحب سے کہنے لگے "میں ستر (۷۰) سال کا ہوں اور عید زوجہ ہوں۔ زندگی بھر نمازیں پڑھیں لیکن وہیں کا وہیں ہوں"۔ میر صاحب نے کہا "میں جس ترکیب سے بتاتا ہوں اب اُس طرح پڑھ کر دیکھئے"۔ وہ ترکیب یہ تھی کہ اپنے کو کربلا میں مولاؑ کے پیچھے نماز میں تصور کریں۔ کچھ دنوں کے بعد جب وہ میر صاحب کے پاس آئے تو کہنے لگے کہ "رقّت کی وجہ سے اب میں نماز پڑھ ہی نہیں سکتا"۔

جب بھی میر صاحب سے میں رخصت لیتا تو دوبارہ آنے کا وعدہ ضرور لیتے تھے۔ ایک دن میں سہ پہر کو گیا تو میر صاحب اکیلے صوفہ پر لیٹے ہوئے تھے۔ میں ساتھ ہی قالین پر بیٹھ گیا اور ان کے پیر دبانے لگا۔ میر صاحب نے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ میں انجینیر ہوں تو کہنے لگے کہ میں بھی انجینیر تھا۔ پھر میر صاحب نے کسی کام کی تفصیل سنائی جو انھوں نے پشاور میں کروایا تھا۔

ایک دن کہنے لگے کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران اُن کا عراق تبادلہ ہوا۔ وہاں انھیں بخار آگیا جو کافی عرصہ تک علاج کے باوجود ٹھیک نہیں ہوا۔ آخر کار انھیں واپس بھیج دیا گیا۔ یہاں آکر ٹھیک ہوگئے۔

"انوارالایقان" کی کچھ کتابت ہو چکی تھی باقی حصّہ کی کتابت گولیمار میں ایک صاحب

سے میں کروا کر لاتا اور میر صاحب کو پڑھ کر سناتا۔ اکثر میں اٹک جاتا تو میر صاحب کہتے کہ ''آپ کو اردو پڑھنا بھی نہیں آتی''۔

ایک دن اتوار کو جب میں ہاکی اسٹیڈیم گیا وہاں میں نے ایک بلند قد کے سیاہ پوش شخص کو دیکھا جس کی داڑھی مونچھ صاف تھی۔ لیکن سر پر ایک چوٹی اور پیر میں کڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ آپ بابا صدا حسین ہیں۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے ایسے شخص کو دیکھا۔ میر صاحب، بابا صدا حسین اور چند لوگ جو ہاں موجود تھے سب کے ساتھ ایک گروپ فوٹو اتارا گیا۔ اس کام کو اکرم صاحب نے جو میر صاحب کے پاس آیا کرتے تھے انجام دیا۔

یہ میری بدقسمتی کہ میں میر صاحب کے جنازہ میں شامل نہ ہو سکا کیوں کہ میں کراچی میں نہیں تھا۔

سبط اکبر رضوی



بسمہٗ

ذیشان صاحب

میں کم ظرف اس قابل تو نہیں کہ سید شفا احمد صاحب جو ادیمؔ تخلص کرتے تھے اُن کے بارے میں کچھ لب کشائی کرسکوں لیکن جو کچھ میں نے دیکھا اور سید صاحب کی زبانی سنا وہ رقم کرنے کی تو جسارت کرسکتا ہوں۔

پہلی ملاقات: میرے ایک دوست شیخ اعجاز صاحب اور لاہور سے آئے ہوئے ایک اور دوست سب رات دو بجے میرے گھر تشریف لائے اور میرے گھر والوں سے کہہ کر مجھے نیند سے اٹھوایا کہ بہت ضروری کام ہے ذیشان کو اٹھا دیجئے۔ میں آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا اور پوچھا خیریت تو ہے تو انھوں نے بتایا کہ ہم ایک بزرگ سے مل کر آئے ہیں کچھ نئی باتیں انہوں نے کی ہیں۔ میں نے کہا کہ میرے لئے مذہب سے متعلق پانچ، بارہ اور چودہ کافی ہیں۔ یہ بتاتا چلوں کہ ہم تینوں ماتمی دوست تھے۔ اس لئے اُن سے میں نے کہا کہ مجھے کسی بزرگ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کیا تمہارا یہ طریقہ درست ہے کہ ایک آدمی کو جو سخت ڈیوٹی انجام دینے کے بعد گہری نیند سو رہا ہو اس کو اُٹھواؤ۔ بہر حال وہ معذرت کرتے ہوئے چلے گئے۔ دوسری رات انہوں نے دوبارہ یہی حرکت کی اور کہنے لگے کہ آپ ہم تینوں میں زیادہ سمجھ دار ہیں ہم آپ کو اگلے دن وہاں لے چلنے کی غرض سے آئے ہیں۔ میں دو سوالوں کو اپنے ساتھ لئے پھر رہا تھا جن کے جواب کیلئے میں نے در در کی ٹھوکریں کھائی تھیں۔ تمام علما، فقہا اور درویش لوگوں سے میں نے جواب چاہا لیکن مجھے تسلی بخش جواب کہیں سے نہیں مل سکا تھا۔ ان کے علاوہ ایک وہ سوال جو میرے ہم مذہب نے کیا تھا اور کہا تھا کہ مجھے وہ بزرگ جو جواب دیں وہ بالکل دو اور دو چار کی طرح ہونا چاہیے۔ اس سوال کے ساتھ میرؔ صاحب کے پاس اپنے دونوں دوستوں کے ساتھ پہنچا اُس وقت میرؔ صاحب ہاکی اسٹیڈیم میں میجر (ریٹائرڈ) سید اصغر شاہ صاحب کے ہاں مقیم

تھے۔ چونکہ میجر صاحب سے میری ملاقات میرے ایک کزن کے توسل سے ہو چکی تھی اُنھوں نے مجھے دیکھ کر خوشی اور گرم جوشی کا اظہار کیا اور کمرے میں لے گئے۔ میں نے ''علیؑ مولا'' کہہ کر سلام کیا تو جواب میں میرؔ صاحب نے ''علیؑ مولا'' کہہ کر جواب دیا۔ اس وقت وہاں پانچ آدمی موجود تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میرؔ صاحب کی عمر اُس وقت پچانوے (۹۵) برس ہوگی اور وزن بمشکل پچیس (۲۵) کلوگرام سے بھی کچھ کم ہی لگا۔ اتنے مختصر سے انسان سے ہم کلام ہونے کے بعد یہ محسوس ہوا کہ اٹھارہ (۱۸) برس کے نوجوان سے گفتگو کر رہا ہوں۔ بہر حال ہم شاملِ محفل ہو گئے۔

ابھی چند لمحے گذرے تھے کہ میرے اندر جو سوال تھا وہ خود ہی میرؔ صاحب نے دہرا دیا۔ میرؔ صاحب سے مراد ادیم نقوی سرکار ہے۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور یقین بھی ہو گیا کہ میرؔ صاحب باطن شناس ہیں۔ انھوں نے اس سوال کا جواب بھی دے دیا جو واقعتاً دو اور دو چار کی طرح تھا لیکن جواب کے فوراً بعد فرمایا کہ یہ مولاؑ کا راز ہے کسی نا اہل کے سامنے بیان کرنے کی سزا ''جوتے کاری'' ہوتی ہے۔ انہوں نے وہ سوال اور جواب اپنی کسی کتاب میں لکھا ہے۔ میں نے چونکہ تمام کتب کا تفصیل سے مطالعہ نہیں کیا ہے اس لئے کتاب کا نام بتانے سے قاصر ہوں۔

اَب ہم لوگوں کی نشست میرؔ صاحب کے پاس روز ہونے لگی (اجازت کیساتھ) تو پہلی بات میرؔ صاحب نے یہ کی کہ یہ مولاؑ کے ذکر کی محفل ہے یہاں آئیں تو دنیا کی جوتیاں باہر اتار کے آئیں۔ چونکہ ایسی باتیں ہم نے اپنی مذہبی کتابوں میں نہیں پڑھی تھیں اِس لئے میرؔ صاحب کی محفل کی گفتگو ہمارے اوپر سے گذر جاتی تھی۔ اُن باتوں کو سمجھنے کیلئے ہمیں جناب میجر اصغر علی شاہ صاحب (مرحوم)۔ جناب شہنشاہ حسین دانش صاحب (مرحوم) اور کرنل ہمدانی اور شبیر بلگرامی صاحب سے مدد کی درخواست کی ضرورت پڑتی تھی جس کے بدلے میں ہمیں ان

بزرگوں کی پوری پوری معاونت حاصل ہوتی تھی۔ جو ہم مکتب اس وقت مولا کے ساتھ ہیں ان بزرگوں کیلئے دعا گو ہوں کہ مولا ان کو اپنے ہی کاموں میں لگائے رکھیں اور جو میرے بزرگ بقید حیات ہیں۔ مولا اُن کا سایہ ہم پر ہمیشہ قائم رکھیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں اور شیخ اعجاز صاحب (مرحوم) سگریٹ وغیرہ لینے کیلئے لکی اسٹار موڑ پر (جو راستہ صدر سے آتا ہے) پان کی دوکان پر رکے تو اچانک ہماری نظر سامنے تکون نما چھوٹے سے پارک پر پڑی جس کے ایک کونے پر چھوٹی سے جھگی نظر آئی اور وہاں علمِ مبارک نصب دکھائی دیا۔ چونکہ سردی کا موسم تھا اور شام کے وقت اندھیرا جلدی ہو جاتا تھا اس لئے جھگی کے پاس علمِ مبارک کی زیارت کیلئے ہم نے جانا چاہا۔ جب ہم پارک کی طرف بڑھے تو ایک لمبی سفید داڑھی والے شخص نے ہمارا استقبال کیا اور ہمارے جوتے اپنے ہاتھ میں لے کے محفوظ مقام پر رکھ دیۓ اور ہم سے کہا کہ آپ بیٹھیۓ میں چائے لے کر آتا ہوں۔ ہم علمِ پاک کی زیارت کرنے کیلئے جھگی کے اندر بیٹھ گئے۔ وہاں اگربتی اور دیا جل رہا تھا اور مچھروں کی بہتات تھی۔ وہ بزرگ آدمی خود ہمارے لئے چائے ہاتھ میں لے کر آیا۔ ہم نے چائے پی اور اُس سے اپنے جوتے طلب کئے۔ وہ کہنے لگا کہ اِدھر انگارے برسیں گے اور صرف وہ گھر بچے گا جس سے حیدرؑ کی صدا آئے گی۔ خیر ہم وہاں سے میر صاحب کی خدمت میں آگئے۔ اور میر صاحب کو تمام واقعہ سنایا۔ میر صاحب نے بغور سنا اور کہنے لگے بابا کا کیا نام تھا ہم نے شائستہ مذاق کے لہجے میں بتایا کہ اُن کا نام تو ہم نے نہیں پوچھا لیکن وہ مچھروں والے بابا تھے۔ میر صاحب سن کر مسکرائے اور فرمایا "کہ یہ دور پھول چنے جانے کا ہے۔ جب چناؤ مکمل ہو جائے گا تو جھاڑ جھنکار کو آگ لگا دی جائے گی"۔ بہر حال میر صاحب نے مچھر والے بابا کی بات غور سے سننے کے بعد اوپر دی ہوئی بات دہرائی۔ لیکن جس بات نے ہمیں حیران کیا وہ یہ ہے کہ پھر کبھی اس جھگی اور علمِ مبارک کو نہ دیکھا حالانکہ ہمارا میر صاحب کے پاس آنے کا وہی راستہ ہوتا تھا۔

ایک رات ہمارے ایک دوست جو لاہور سے آئے ہوئے تھے مشہور منقبت پڑھنے والے کو میر صاحب کے پاس لے آئے اور کہنے لگے کہ گامے شاہ لاہور میں یہ صاحب ہر شب جمعہ موؑلا کی منقبت پڑھتے ہیں اس لئے آپ کو سنانے کیلئے ان کو لے آیا ہوں۔ انہوں نے موؑلا کی شان اور مدح میں بہت چیدہ کلام پڑھا اور چونکہ اُن کی آواز بہت سوز وگداز والی تھی اس لئے میر صاحب نے بھی بڑے محو ہو کے سنا۔ جب وہ صاحب چلے گئے تو میں نے میر صاحب سے کہا کہ ان صاحب نے تو موؑلا کے فضائل خوب پڑھے۔ کیسا کیسا کلام شاعروں نے موؑلا کی شان میں لکھا ہے میر صاحب کیا آپ کو پسند آیا تو فرمانے لگے کہ " موؑلا کے فضائل کون لکھ سکتا ہے۔ موؑلا کے مصائب ہی مولا کے فضائل ہیں"۔

ایک دفعہ میر صاحب اچھے موڈ میں تھے تو میں نے عرض کیا کہ میر صاحب میرا ایک کام کر دیجئے۔ فرمایا بتاؤ۔ میں اس سے پہلے یہ بتا دوں کہ ہمارا تعلق ماتمی گروپ سے تھا اس لئے کسی مولوی صاحب کی مجلس ہم سنتے نہیں تھے اور مجلس ختم ہونے کے بعد ماتم کرنے کے انتظار میں رہتے تھے اس لئے رونے اور گریہ کرنے سے قریب قریب دور تھے۔ جب میر صاحب نے کہا بتاؤ کیا کام ہے تو میں نے اُن کے پیر دباتے ہوئے کہا کہ میرا کام تو آپ کی ٹھوکر میں ہے۔ فرمانے لگے بتاؤ کیا کام ہے تو میں نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ مجھے توفیقِ گریہ دے دیں تو فوراً فرمایا کہ اس کے بعد رہ ہی کیا جائے گا۔ موؑلا کے صدقے سے یہ نعمت مجھے میر صاحب سے مل گئی اور جتنی بھی ہے وہ میرے پاس ہے۔ جو بھی وقت میر صاحب کی خدمت میں گزرا اُس میں ایک واقعہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میرا اور شیخ عجاز صاحب (مرحوم) کا تعلق ہم مکتب ہونے کے علاوہ بھی بہت پرانا تھا۔ ایک دفعہ شیخ صاحب (مرحوم) نے ارادہ ظاہر کیا کہ باوا سرکار سید صدا حسین جلالی قلندری جو کہ پنجاب کے ایک بہت مشہور عزادار ہیں اُن کو کسی طرح میر صاحب کی خدمت میں لایا جائے پھر اِن دونوں کی باتیں سننے کا موقع مل سکے گا۔ اس سلسلے میں اُنہوں نے لاہور

سے اطلاع حاصل کی کہ فلاں تاریخ کو باوا صاحب لعل شہباز کی درگاہ میں حاضری دینے کے لئے آنے والے ہیں۔ اب ہم چار آدمی بہ شمول شریف بھائی (جو باوا صاحب کے ہی گاؤں کے رہنے والے تھے) سہون شریف روانہ ہو گئے۔ چونکہ ہمیں پہنچنے میں رات کافی ہو گئی تھی اس لئے وہاں پر پہنچے جہاں باوا سرکار کا قیام تھا۔ چونکہ دربار بند ہو چکا تھا اس لئے اُن کے پاس ہی رات گذاری جو حقیقتاً ایک روحانی محفل تھی۔ وہاں میرے ساتھ ایک ایسی بات ہوئی جس سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ باوا صاحب ایک محرم راز ہیں۔ خیر صبح دربار کھلتے ہی ہم نے جا کر حاضری دی اور سجدہ سلام کیا (باوا صاحب کی معیت میں)۔ اَب ہم یہ سوچ رہے تھے کہ باوا صاحب سے کس طرح اپنا مدعا بیان کریں۔ خیر اسی تگ و دو میں دوپہر کا وقت ہو گیا۔ باوا صاحب نے میزبان سے کہا کہ ایک گاڑی کراچی کیلئے منگوائی جائے۔ اَب ہم چھ(۶) آدمی ہو گئے اور نوریا آباد تک یہی کوشش کرتے رہے کہ مدعا کیسے بیان کیا جائے۔ خیر شریف بھائی کے ذہن میں ایک ترکیب آئی انہوں نے باوا سرکار سے عرض کی کہ میں نے کراچی میں ایک بڑے سائز کی دوکان خریدی ہے میں اُس وقت تک کوئی کاروبار شروع نہیں کرونگا جب تک آپ کے قدمِ مبارک دوکان میں نہیں جائیں گے۔ باوا سرکار نے جواب دیا کہ ٹھیک ہے اور فرمایا کہ (پیر درویشاں ردِ بلا)۔ ہمارا مسئلہ کافی حد تک حل ہو چکا تھا کہ ٹول پلازہ کے پاس باوا سرکار نے شیخ اعجاز صاحب (مرحوم) سے کہا کہ مجھے حکم ملا ہے اور ایک سید زادہ سے مجھے پہلے ملنا ہے اُس کا قیام ائیر پورٹ سے صدر جاتے ہوئے بائیں ہاتھ پر کہیں ہے اگر آپ لوگ سب وہاں چلیں تو بہتر ہوگا۔ لیجئے ہمارا مسئلہ بالکل حل ہو گیا کیوں کہ میر صاحب سرکار کا قیام ہاکی اسٹیڈیم میں تھا۔ ہم ویگن لے کر سیدھے ہاکی اسٹیڈیم پہنچ گئے۔ اُس وقت رات ہو چکی تھی اور ہفتہ وار مجلس ہو رہی تھی شبیر بلگرامی صاحب شاید دوسری یا تیسری مجلس (مجالس الصادقین) سے پڑھ رہے تھے۔ ہم اندر پہنچنے کے بعد اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے جب کہ باوا سرکار وہیں جوتوں کی جگہ بیٹھ

گئے۔ (یہ تھے آدابِ مجلس)۔اُس کے بعد پہلا جملہ میؔر صاحب سرکار نے باوا سرکار سے کہا کہ میں آپ کا چار ماہ سے انتظار کر رہا ہوں۔اس کے بعد جو کچھ پیش آیا وہ قریب قریب سب شرکاء مجلس نے مشاہدہ کیا جب باوا سرکار میؔر صاحب سرکار سے رخصت ہوئے تو باہر پورچ کے پاس ہم سے کہا کہ "یہاں نور کا سمندر ہے اپنے ظرف کے مطابق بھرنے میں تساہلی نہ کرنا"۔ پھر گاہے بگاہے باوا سرکار لاہور سے میؔر صاحب سے ملاقات کیلئے آئے اور میؔر صاحب کے کمرے کے باہر ہی بستر جما لیا اور بتایا کہ میرے اندر میؔر صاحب کے کمرے میں قیام کرنے کی ہمت نہیں۔ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ میؔر صاحب پلنگ پر لیٹے ہوئے ہیں اور باوا سرکار نے اپنا سر اُن کے سینے سے لگایا اور پیٹ میں رکھ کر کافی دیر تک گھماتے رہے۔(یہ بھی کوئی رمز تھا)۔

اَب میں وہ واقعہ بھی سپردِ قلم کر رہا ہوں جس شب میؔر صاحب نے پردہ فرمایا اُنہوں نے آخری جملہ میرے ساتھ ہی ادا کیا اور فرمایا کیسے ہو۔اور خاموش رہے۔ایک بات اور بتا دوں کہ پردہ کرنے سے ایک ہفتہ پہلے ہم سب نے سوچا کہ میؔر صاحب کی صحت کو دیکھتے ہوئے اگر کوئی ایسا ویسا وقت آ جائے تو میؔر صاحب کی آخری آرام گاہ کے متعلق اُن سے پوچھ لینا بہتر ہوگا۔اس کام کیلئے ہم نے میجر اصغر (مرحوم) سے کہا۔اُنہوں نے جواب دیا کہ یہ کام میں نہیں کر سکتا۔ خیر ڈاکٹر دانش (مرحوم) اس کام کیلئے تیار ہو گئے۔میؔر صاحب سرکار نے جواب میں فرمایا کہ جہاں مولا کا نام زیادہ لیا جائے وہ بہتر ہوگا۔اگلے روز ہم نے اپنی اپنی رائے دی اور مختلف امام بارگاہوں کو ذہن میں سوچا تو میجر اصغر (مرحوم) نے انکشاف کیا کہ تم لوگ بے وقوف ہو رات دو بجے تک اس مسئلہ پر بحث کرتے رہے صبح ہی میرا رابطہ باوا سرکار سے ہوا اور اُنہوں نے لاہور سے مطلع کیا ہے کہ میؔر صاحب ہر حال میں میرے ہیں اور اگر ایسا وقت آ جائے تو اُن کے جسد خاکی کو لاہور لے کر آ جانا۔خیر وہ وقت آ گیا کیوں کہ جس رات میؔر صاحب نے پردہ فرمایا اُس رات میرے اور میجر صاحب (مرحوم) کے علاوہ میؔر صاحب کے پاس کوئی اور نہیں آ سکتا تھا۔خیر

صبح مجھے آفس میں اطلاع ہوئی میں فوراً ہاکی اسٹیڈیم پہنچ گیا۔ یہاں جو کچھ میں لکھنا یا کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ باوا سرکار کو لاہور میں اطلاع دینے کا صرف ایک ہی ٹیلیفون کا ذریعہ تھا جو لاہور کی امام بارگاہ کے برابر پیٹرول پمپ پر تھا۔ جو آدمی باوا سرکار کو اطلاع دیا کرتا تھا وہ صبح دس بجے آیا کرتا تھا۔ جیسے ہی وہ صاحب آئے ہم نے باوا کو میر صاحب کی اطلاع دی اور مختلف کاموں میں لگ گئے کوئی پولس کی راہداری کیلئے اور کوئی (Box) بنوانے کوئی ائیر ٹکٹ لینے کیلئے۔ صرف شبیر بلگرامی صاحب کو اطلاع نہیں ہوسکی کیونکہ وہ کہیں گھر سے باہر تھے۔ وہ بھی مطلع ہو ہی گئے۔ اَب لاہور کی سنئے کہ صبح چار بجے چار زمینداروں نے لاہور کے چار کونوں پر ایک ہی خواب دیکھا کہ وہ امام بارگاہ میں قبر کھود رہے ہیں۔ اُنھوں نے خیال کیا کہ باوا سرکار کو کچھ ہوگیا ہے۔ تقریباً ساڑھے پانچ بجے صبح اپنی اپنی گاڑیوں میں پہنچ گئے اور امام بارگاہ کے اندر داخل ہوئے تو اُن چاروں نے دیکھا کہ باوا صاحب سیڑھیوں سے نیچے آرہے ہیں۔ سجدہ سلام کر کے اُنھوں نے اپنا خواب بیان کیا تو باوا سرکار نے اپنے آدمیوں سے قبر کھودنے کا سامان منگوا کر اُن چاروں کو دیا کہ جس جگہ کیلئے خواب دیکھا ہے وہیں قبر بناؤ کیونکہ ایک سیّد زادہ جس نے مجھے پہچانا ہے وہ آرہا ہے۔ بہر حال ہم رات آٹھ بجے میؔر صاحب کے ہمراہ لاہور پہنچے دیکھا وہاں ایک جمِ غفیر تھا۔ ایسی مجلس ہوئی کہ میں نے آج تک نہیں سنی اور ماتم داری کے بعد تدفین ہوئی۔ رات تین بجے رفع حاجت کیلئے باہر نکلے تو دیکھا کہ باوا سرکار قبر کے سرہانے بیٹھے میؔر صاحب سے کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ ایک ہی جملہ سن سکے کہ ”میؔر صاحب آپ کچھ تکلیف تو محسوس نہیں کر رہے ہیں“۔ آخر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم کم ظرف تھے نہیں سمجھ سکے میؔر صاحب سرکار کو۔

ذیشان



تاریخِ وصالِ حضرت سیّد شفاء احمد نقوی المتخلص ادیؔم

ادیبے کہ فکر از اسیرانِ دامش   خیابانِ اسرار مست خرامش

وہ ادیم کہ فکر ان کے دام کے اسیروں سے ہے اور رازوں کی کیاریاں اُن کی رفتار پرست ہیں

بگورِ خرد عاذرانِ طلب را   دہد زندگانی مسیحِ کلامش

عقل کی قبر میں طلب کے مُردوں (عاذر وہ پہلا شخص جسے حضرت عیسیٰ نے زندہ کیا) کو ان کے کلام کا مسیحا زندگی بخشتا ہے

زِکلکش بود لوحِ اثبات نقشے   دو جبریل دریک صریرِ پیامش

لوحِ اثبات ان کے قلم کا ایک نقش ہے جس کے پیغام کی ایک آواز میں دو جبریل پوشیدہ ہیں

درخشندہ بر آسمانِ طہارت   درابرِ عبارفت ماہِ تمامش

آسمانِ طہارت پر جگمگانے کے بعد ان کا ماہِ کامل چادرِ تطہیر کے بادل میں چلا گیا

چو گردِ رہِ عشقِ لولاکیاں شد   بہاتف سپردند نصِّ دوامش

۱۳۵۴ھ شمسی + ۱۳۹۵ھ قمری = ۲۷۴۹

جب وہ صاحبانِ لولاک کی راہِ عشق کی گرد بن گئے تو اُن کی حیاتِ جاوید کی آیت ہاتف کے سپرد کی گئی

بہ نخستین روشِ لیل و نہار آخر شد

لیل و نہار کی پہلی ہی روش پر پھول کا چہرہ

روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

جی بھر کے دیکھنے سے پہلے ہی بہار ختم ہوگئی

۱۹۷۵ء لندن ڈاکٹر سید شہنشاہ حسین (واثق)